اسلام اور عصرِ جدید

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی - ۲۵

اسلام اور عصرِ جدید

مدیر

اقتدار محمد خاں

نائب مدیر

محمد سعید انور

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۲۵

اسلام اور عصرِ جدید (سہ ماہی)

(جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر)

جلد نمبر: ۵۵ جنوری ۲۰۲۳ء شمارہ: ۱

ISSN 2278-2109

اعانت زر کی شرحیں

	فی شمارہ	سالانہ	
اندرون ملک	100/روپے	380/روپے	(رجسٹرڈ ڈاک سے)
پاکستان و بنگلہ دیش	4/امریکی ڈالر	15/امریکی ڈالر	(رجسٹرڈ ڈاک سے)
دیگر ممالک	12/امریکی ڈالر	40/امریکی ڈالر	(رجسٹرڈ ہوائی ڈاک سے)

حیاتی رکنیت

اندرون ملک	5000/روپے
پاکستان و بنگلہ دیش	150/امریکی ڈالر
دیگر ممالک	400/امریکی ڈالر

اس شمارے کی قیمت 100/روپے

پرنٹنگ اسسٹنٹ: راشد احمد **ٹائٹل:** ارتیج گرافکس

© جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ
مقالہ نگاروں کی رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

پتہ

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

Website: www.jmi.ac.in/zhiis E-mail:zhis@jmi.ac.in

طابع وناشر: **پروفیسر اقتدار محمد خاں** اعزازی ڈائرکٹر، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔۲۵

مطبوعہ : لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲

بانی مدیر

ڈاکٹر سید عابد حسین (مرحوم)

مجلسِ ادارت

پروفیسر نجمہ اختر (صدر)

- پروفیسر طلعت احمد
- نجیب جنگ آئی۔اے۔ایس (ریٹائرڈ)
- سید شاہد مہدی آئی اے ایس (ریٹائرڈ)
- لیفٹیننٹ جنرل محمد احمد ذکی (ریٹائرڈ)
- پروفیسر اختر الواسع
- پروفیسر محمود الحق
- پروفیسر سلیمان صدیقی

فہرست

- حرف آغاز — اقتدار محمد خاں — ۷
- مذہبی تصورات کا مبداء کیا ہے؟ — سید محمد کاظم نقوی — ۱۳
- خواجہ محمد گیسو دراز حسینی اور اسلامی علوم کی تدریس — محمد فہیم اختر ندوی — ۳۹

- ہندوستانی مذاہب پر مسلم علماء کا تحریری سرمایہ — ظفر دارک قاسمی — ۴۵
- مناظر احسن گیلانی اور ان کے تعلیمی نظریات — عمار عبدالحئ — ۱۰۵
- مولانا محمد سالم قاسمیؒ اور علم حدیث — انیس الرحمٰن قاسمی — ۱۳۳

حرف آغاز

حضرت زینب بنت خزیمہ حارث ہلالی کی اولاد میں تھیں۔ بنو ہلال قبیلہ بنو عامر کی ایک شاخ تھی جو حضرت اسماعیل کی اولاد میں سے تھے۔ آپؓ کا سلسلۂ نسب حسبِ ذیل ہے۔ زینب بنت خزیمہ بن حارث بن عبداللہ بن عمرو بن عبد مناف بن ہلال بن عامر بن صعصعہ بن معاویہ بن بکر بن ہوازن بن منصور بن عکرمہ بن خصفہ بن قیس بن عیلال الہلالیہ۔ سیدہ زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا کا سلسلہ نسب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب میں اکیسویں پشت میں جا کر معد بن عدنان سے مل جاتا ہے۔ سیدہ زینب کی ولادت نبی کریم کے اعلان نبوت سے تقریباً تیرہ سال پہلے ہوئی۔

حضرت اسماعیل کی اولاد میں سے ایک بڑا قبیلہ بنو عامر تھا جس کی شاخ بنو ہلال تھی، وہ یمن میں آ کر آباد ہوگئی تھی۔ یہ لوگ

خوش حال تھے لیکن اللہ کے نافرمان بھی، مذہبی اعتبار سے پکے مشرک تھے اور سورج و چاند کے علاوہ بھی کئی خود ساختہ معبودوں کی پوجا کرتے تھے۔ شمالی یمن کے علاقہ تبالہ میں ذوالخامہ نامی ایک بڑا بت تھا۔ یہ لوگ اس بت کی بطور خاص پوجا کرتے تھے۔ اس قوم پر کئی بار سیلاب کا عذاب آیا۔ انھوں نے سیلاب سے بچنے کے لیے مآرب کے نام پر ایک مضبوط ترین بند باندھا تھا۔ مآرب قوم سبا کا دارالحکومت تھا۔

یہ قوم شرک اور معاشرتی گناہوں کے نشے میں مست تھی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ایسا زور آور سیلاب بھیجا جس نے اس مضبوط بند کو توڑ دیا، کھیتیاں اجاڑ ڈالیں، پھر اس میں سوائے جھاؤ اور بیڑی جیسی جھاڑیوں کے کچھ بھی نہیں اگتا تھا۔ قوم سبا پر آنے والے عذاب کا تذکرہ قرآن کریم کی سورۃ السبا میں موجود ہے۔ سیلاب کے عذاب سے جب ان کے مکانات اور بستیاں کھنڈرات اور ویرانے کی صورت اختیار کر گئیں تو وہ لوگ وہاں سے نقل مکانی کر گئے۔ انھیں لوگوں میں سیدہ زینب بنت خزیمہ کا قبیلہ بنو ہلال بھی شامل تھا جو یمن سے حجاز آ کر آباد ہوا۔ آپؓ کے والد خزیمہ کا شمار عرب کے رؤساء میں ہوتا ہے، اس لیے سیدہ زینب کا بچپن بڑے ناز و نعم میں گزرا۔ اس کے باوجود بعض انفرادی خصوصیات ایسی تھیں جو آپؓ کو اپنی ہم جولیوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ چونکہ آپ کی ولادت بعثت نبوی سے تیرہ سال قبل ہوئی تھی، اس لیے اعلانِ نبوت کے کچھ عرصہ بعد جو لوگ مسلمان ہوئے ان میں سیدہ زینب بنت خزیمہ بھی شامل ہیں۔

سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ آپؓ کا پہلا نکاح طفیل بن

حارث سے ہوا۔ ان کے ساتھ آپ رضی اللہ عنہا کچھ عرصہ ازدواجی زندگی کی بہاریں دیکھ پائی تھیں کہ انھوں نے آپؐ کو کسی وجہ سے طلاق دے دی۔

طلاق کے بعد آپؓ کا نکاح طفیل کے بھائی حضرت عبیدہ بن حارثؓ سے ہوا۔ حضرت عبیدہ اور سیدہ زینبؓ بھی مشرکین مکہ کی جانب سے مصائب ومشکلات سے دوچار تھے۔ اسی دوران ہجرت کا حکم نازل ہوا اور دونوں میاں بیوی ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے۔ کچھ دنوں بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو آپؐ نے حضرت عبیدہ بن حارث کا حضرت عمیر بن حمام انصاری سے مواخاۃ کرایا۔ حضرت عمیر نے حضرت عبیدہ کے لیے ایک مکان اور کافی زمینیں وقف کر دیں۔

مدینہ منورہ ہجرت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات، ان کے جاں نثار صحابہ کے حسن سیرت اور اعلیٰ اخلاق وکردار اور اپنی حقانیت وصداقت کی بنیاد پر اسلام قرب وجوار میں اپنی مقبولیت کا سکہ منوا رہا تھا اور دوسری طرف مکہ کے کفار ومشرکین اور مدینہ کے یہود ونصاریٰ کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام ومسلمین سے عناد بڑھتا گیا اور نقصان پہونچانے کے منصوبے تیار ہونے لگے۔ ظاہر ہے کہ ان کے سد باب کے لیے آپؐ نے بھی دفاعی پوزیشن لی اور ہجرت کے آٹھویں ماہ شوال کے آغاز میں آپؐ نے رابــغ نامی علاقے کی جانب ایک سریہ روانہ کیا اور حضرت عبیدہ بن حارث کو اس سریہ کا امیر مقرر کیا۔ معمولی جھڑپ کے بعد کفار مکہ فرار ہو گئے اور کوئی بڑی جنگ نہ

ہوئی۔اس سریہ کو سریہ حضرت عبیدہ بن حارث کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

چند مہینے بعد ۱۷؍رمضان ۲ہجری میں غزوہ بدر کا واقعہ پیش آیا۔ یہ اسلامی تاریخ کا حق و باطل کے درمیان پہلا باضابطہ معرکہ تھا۔ دونوں لشکروں میں صف آرائی ہوئی۔حضرت عبیدہ اور ولید میں کافی دیر تک لڑائی جاری رہی اور دونوں ہی زخمی ہوگئے۔حضرت علیؓ اور حضرت حمزہؓ نے آگے بڑھ کر ولید کو قتل کردیا۔اس معرکہ میں حضرت عبیدہ کا ایک پیر زخمی ہوگیا۔زخم کاری تھا،حضرت عبیدہ اس کی تاب نہ لاسکے اور واپسی میں مقام صفراء پر داعی اجل کو لبیک کہا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔حضرت زینب بیوہ ہوگئیں۔بعض روایات کے مطابق اس کے بعد حضرت زینب کا نکاح حضرت عبداللہ بن جحش سے ہوا۔حضرت عبداللہ بن جحش جنگ احد میں شہید ہوگئے۔اس کے بعد حضرت زینب آپؐ کے نکاح میں آئیں۔

جس وقت حضرت عبیدہ شہید ہوئے حضرت زینب زخمیوں کو پانی پلانے اور ان کی مرہم پٹی میں مصروف تھیں لیکن انھوں نے صبر واستقامت کے ساتھ اپنے کام کو جاری رکھا یہاں تک کہ اللہ نے مسلمانوں کو فتح سے ہم کنار کیا۔

حضرت عبداللہ بن جحش غزوہ احد میں شہید ہوئے۔ان کی شہادت کے بعد ذی الحجہ ۳؍ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپؓ سے نکاح کرلیا۔بعض روایت کے مطابق ۴۰۰ درہم حق مہر طے ہوا۔

نکاح کے وقت حضرت زینب کی عمر تیس سال تھی۔اس نکاح میں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیشِ نظر اہلِ مدینہ کی دل جوئی تھی۔ مدینہ کے انصار و مہاجرین اور شہدا کے لواحقین نے آپؐ کے اس اقدام کو شہداء کے لیے ایک بہترین خراجِ تحسین کے طور پر پسند فرمایا اور یہ نکاح ان کی حوصلہ افزائی کا سبب بنا۔ حضرت زینب سے شادی کے اس فیصلے نے مدینہ کی مجموعی صورتِ حال پر نفسیاتی، سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے بڑے مثبت اثرات مرتب کئے۔

حضرت زینب کے والد خزیمہ مکہ کے بڑے رئیس تھے۔ آپؓ کی پرورش ایک شہزادی کی طرح ہوئی تھی، اس کے باوجود عاجزی، انکساری، فیاضی وسخاوت اور رحم و ہمدردی کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ بچپن ہی سے لوگوں کے دکھ درد میں ساتھ دینا، ان سے ہمدردی کرنا اور ان کا مالی تعاون کرنا آپؓ کا معمول تھا۔ آپؓ کی فیاضی وسخاوت اتنی عام ہوئی کہ اہلِ مکہ آپؓ کو ''ام المساکین'' کہنے لگے۔ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں بھی ان کی سخاوت وفیاضی کا فیض بدستور جاری رہا۔ آپؓ کے شوہران بھی حسنِ اتفاق سے رسولِ خدا کے سچے جاں نثار تھے، لہٰذا سخاوت ان کی معیت میں بھی بدستور جاری رہی اور اہل مدینہ انھیں نام کے بجائے ''ام المساکین'' کے لقب سے پکارا کرتے تھے۔

حضرت زینب کو حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ کی سہیلی ہونے کا شرف بھی حاصل رہا ہے۔ وہ دونوں نبیؐ سے نکاح پر بے حد خوش تھیں اور انھوں نے حضرت زینب کی بڑی دل جوئی کی تھی۔

حضرت زینب کو آپؐ کی معیت میں زیادہ وقت گزارنے کا

موقع نہیں ملا۔ اس سلسلے میں مؤرخین نے دو ماہ سے لے کر آٹھ ماہ یا اس سے کچھ زیادہ کا تذکرہ کیا ہے۔ کسی قول کو بھی اختیار کریں تو حضرت زینب کا آپؐ کے ساتھ زمانۂ معیت بہت مختصر رہا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ حضرت زینب کے تعلق سے بطور ام المومنین معلومات کم دستیاب ہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے مطابق سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کا انتقال ربیع الثانی ۸ھ ہجری میں ہوا۔ آپ کی نمازِ جنازہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھائی اور مدینہ منورہ کے جنت البقیع میں آپ مدفون ہیں۔ امہات المومنین میں صرف حضرت زینب کو یہ اعجاز حاصل ہے کہ آپ کی نمازِ جنازہ خود نبی نے پڑھائی۔ اگرچہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات بھی نبی کے عہدِ مبارک میں ہوئی تھی لیکن اس وقت تک جنازے کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔

اقتدار محمد خاں

سید محمد کاظم نقوی *

مذہبی تصورات کا مبداء کیا ہے؟

(آخری)

مذہب اور اقتصادیات

ہر زمانے میں انسان کی زندگی کا ایک ڈھانچہ رہا ہے۔ ایک دور میں بہت سے لوگ مِل جُل کر مچھلیوں، پرندوں اور چوپایوں کا شکار کرتے تھے۔ اسی پر اُن کے گزر بسر کا دارومدار تھا۔ پھر کھیتی باڑی کرنے لگے۔ ایک دور آیا کہ انھوں نے چھوٹے چھوٹے کاروبار شروع کر دیے۔ بہرحال انسان مختلف طریقوں سے بسر اوقات کرتا رہا ہے۔ مادّہ پرستوں کے ایک طبقے کا خیال ہے کہ ہر زمانے کے تہذیب وتمدن، عمومی اخلاق وعادات، شاعری اور ادبیات یہاں تک کہ لوگوں کے رجحانات اور میلانات کا سرچشمہ ہر زمانے کے مخصوص اقتصادی حالات ہیں۔ یہ طبقہ بتا سکتا ہے کہ فلاں کلچر، فلاں تمدن، فلاں عقیدے، فلاں علمی کدّ وکاوش، فلاں ادبی کارنامہ، فلاں طرزِ تعمیر کے پس منظر میں کون سا اقتصادی نظام موجود ہے۔ تاج محل کا گنبد، اُس کے مخصوص طرح کے مینار، اُس کی خوبصورت نازک جالیاں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ اُن کے اور اُس دور کے اقتصادی نظام کے درمیان علت ومعلول کا رشتہ ہے۔ فردوسی

* سابق پروفیسر، شعبۂ دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

کے شاہ نامے، سعدی کی گلستاں و بوستاں، خیام کی رباعیات، حافظ کی غزلوں، میر انیس کے مراثی، شکسپیر کے ڈراموں کو دیکھ کر بخوبی سمجھا جاسکتا ہے کہ ان ادبی کارناموں کے دور میں کون سا اقتصادی نظام رائج تھا۔ ارسطو کی علمی موشگافیوں، بطلیموس کے ہیئتی مفروضات، جالینوس کے طبی نظریات، قانون بوعلی سینا کے مضامین، اسفار ملا صدرا کے مندرجات، ڈارون کے نظریہ ارتقاء، نیوٹن کے قانون جذب وکشش، لوئی پاسچر کا دریافت کردہ جراثیم، کاپرنکس کے زمین کے بجائے سورج کو مرکز سیارات قرار دینے، گیلیلو کے دوربین ایجاد کرنے کا سبب ہر ایک زمانے کے مخصوص اقتصادی حالات تھے۔

مادّیین کے اس طبقے نے ادیان و مذاہب کو بھی اقتصادیات کی پیداوار قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انسانی تاریخ کی تشکیل طبقاتی ٹکراؤ نے کی ہے۔ اس عظیم اور ہمہ گیر جنگ کے دوران مال دار زبردست سامراجی طاقتوں نے غریب، مفلس، کمزور، محنتی طبقے سے فائدہ اٹھانے کے لیے طرح طرح کے ہتھ کنڈے استعمال کیے۔ دولت مند لوگوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ غریب اور مزدور طبقہ کبھی اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے کھڑا نہ ہونے پائے۔ اُن کی یہ دلی تمنا رہی کہ وہ ہر قسم کی محرومی اور مایوسی سے نباہ کرتا رہے۔ انھوں نے اپنا مقصد حاصل کرنے کی خاطر مذہبی عقائد کو ان کے درمیان خوب خوب پھیلایا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان مذہبی عقائد کی روشنی میں وہ یہ سمجھتے رہیں کہ محرومی ہماری تقدیر میں لکھی ہوئی ہے۔ اس سے چھٹکارا غیر ممکن ہے۔ اس مقابلے میں صبر و تحمل سے کام لینا آخرت کے اجر و ثواب کا موجب ہے۔

اس طبقے کے بعض لوگوں نے اس سے بھی آگے قدم رکھا ہے۔ انھوں نے صرف یہی نہیں کہا ہے کہ مذہبی عقائد تو سرمایہ داروں نے پھیلایا ہے۔ انھوں نے غریب، نادار مزدوروں کو آخرت، بہشت اور حور و غلمان کے تصورات سے بہلایا ہے بلکہ اُن کا دعویٰ ہے کہ ان تصورات کو وہی وجود میں لائے ہیں۔ دین کو سرمایہ داروں نے خلق کیا ہے۔ اس بارے میں روسی دائرۃ المعارف میں یوں اظہار خیال کیا گیا ہے۔

> ''اسلام تمام دوسرے ادیان و مذاہب کی طرح سرمایہ دار سامراجی طاقتوں کی جانب سے وجود میں آیا ہے۔ اُن کا مقصد یہ تھا کہ مذہب کا رُوحانی اقتدار مزدور وش اور عوام الناس پر قائم ہو۔ وہ اس طرح سے انھیں اپنے قابو میں رکھیں۔''[۱]

ان لوگوں کے مقابلے میں بعض مادیین کا خیال ہے کہ خدا اور دوسرے ماوراء طبیعت امور کے عقیدے کو غربت، افلاس، فقر اور تنگ دستی نے پیدا کیا ہے۔ محروم، تہی دست، کمزور قوموں نے رحیم وکریم خدا، روز آخرت، جزا وسزا، جنت، حور وغلمان، کوثر وتسنیم کے تصورات کو اپنا دل خوش کرنے کی غرض سے تراشا ہے۔ معاشی اور سماجی محرومی نے اُن کے دلوں میں آگ لگا دی تھی۔ انھوں نے یہ مذہبی تصورات ایجاد کر کے اپنی تسکین اور تسلی کا سامان فراہم کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن فلاسفہ نے کھاتے پیتے ماں باپ کی گود میں پرورش پائی ہے جو خوش حال گھرانوں میں پروان چڑھے ہیں وہ مادّہ پرست ہیں اور مذہبی عقائد سے آزاد نظر آتے ہیں۔ اس کے برخلاف جن فلاسفہ نے غریب اور تنگ دست والدین کی آغوش میں آنکھ کھولی ہے، جنھیں کبھی اطمینان سے پیٹ بھرنے کے لیے روٹی اور تن ڈھانکنے کے واسطے کپڑا نصیب نہیں ہوا ہے وہ دینی عقائد کے پابند دکھائی دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ایک وقت تھا جب ہیگل کی یہ آواز علمی دنیا میں گونج رہی تھی کہ ''انسان کے افکار وخیالات اس کی تاریخ زندگی کے معمار ہیں۔'' اس کے مقابلے میں کارل مارکس اور اُن کے پیروؤں کا عقیدہ ہے کہ ہر چیز کی بنیاد یہاں تک کہ افکار وخیالات کا سرچشمہ اقتصادیات اور پیداوار کے ذرائع ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک معاشرے کی مختلف تبدیلیوں کے اسباب کی فلاسفہ اور مفکرین کے آرا وافکار میں نہ ڈھونڈھنا چاہیے بلکہ اس کے لیے اقتصادی اور معاشی حالات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ انسانی زندگی کے مختلف حالات ذہنی اور دماغی کارگزاریوں کا نتیجہ نہیں ہیں۔ حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے۔ انسان کے افکار وخیالات کو اُس کے اقتصادی حالات وجود میں لاتے ہیں۔ اس نظریے کے ہم دگر دائرے میں مذہبی عقائد بھی داخل ہیں۔

اس سلسلے میں مندرجہ ذیل ماخذوں کا مطالعہ تصدیق کے لیے کافی ہے۔

۱۔ تاریخی میٹیریلزم، ص:۶۱-۹۹

۲۔ زندگی واصالت مذہبی، ص:۵۶

۳۔ لذات فلسفہ، ص:۲۷۲

۴۔ **التطور والثبات فی الحیاۃ البشریۃ**، ص:۴۰

۵۔ مانیفسٹ، ص:۳ (طبع سوم)

۶۔ میٹیریلزم اور کمیونزم، ص۱۰۲

۷۔ دائرۃ المعارف روسی، ج:۱۸،ص:۳۱۶

وہ خود ترمیم کر رہے ہیں!

کارل مارکس نے شروع شروع میں انسانی زندگی کا حاکم اقتصادیات کو قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ معاشرے میں جو بھی تبدیلیاں سامنے آئیں اُن کی آخری اور انتہائی علت معاشی حالت ہے۔ یہ نظریہ دوسرے مذہبی، معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی مکاتب خیال کے بالکل مخالف تھا۔ کارل مارکس کے طرف داروں نے اس کے ذریعے تمام دوسرے نظریات کو غلط اور غیر علمی قرار دیتے ہوئے منسوخ کر دیا۔ بعد میں ثابت ہوا کہ یہ ایک قسم کی افراط پسندی اور مبالغہ آمیزی ہے۔ آخر میں کارل مارکس کو خود اپنے طرف داروں پر نکتہ چینی کرنا پڑی۔ انھوں نے ان پر الزام لگایا کہ تم نے میرے نظریات کو مسخ کر دیا ہے۔ انھوں نے اس کا اظہار اُس خط میں کیا جو اپنے ایک انتہا پسند طرف دار کو ۱۸۷۷ء میں لکھا ہے:

> ''ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا کہ ایک انٹرنیشنل پاسپورٹ میں ایک ہمہ گیر تاریخی اور فلسفی مفروضے کے ذریعے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مافوق تاریخ واقع ہوا ہے تمام قضایا اور مسائل کو حل کر دیا جائے۔''[۲]

اینگلس شروع سے کارل مارکس کے ہم خیال تھے۔ انھوں نے ہر میدان میں اُن کی نصرت اور حمایت کی۔ ابتدا میں انھوں نے دعویٰ کیا کہ معاشیات پر ہر چیز کی بنیاد ہے لیکن آخر میں وہ مجبور ہوئے کہ اپنی پارٹی کے تیز رفتار نوجوان ممبران کی اصلاح کریں۔ انھوں نے اُن پر الزام لگایا کہ تم نے ہمارے نظریات کو بہانہ قرار دیتے ہوئے تاریخ کے مطالعے سے چشم پوشی کر لی ہے۔ اینگلس نے صاف لفظوں میں انھیں بتایا کہ یہ خیال خام ہے کہ تمام تاریخی واقعات اور حالات اقتصادی علل و اسباب کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً یہ واقعہ کہ جرمنی میں کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ وہاں کی تمام باشندہ قوموں نے ہم آہنگ ہو کر ایک متحدہ ملت کی شکل اختیار کر لی۔ اس کے لیے کوئی اقتصادی اور معاشی سبب نہیں بتایا جا سکتا۔ اینگلس نے تصریح کی ہے کہ مارکس کا یہ نظریہ نہیں تھا کہ تاریخی تبدیلیوں کی علت صرف اقتصادی حالات ہیں بلکہ اُن کا مقصد یہ تھا کہ انسانی زندگی میں جو تغیرات رونما ہوتے ہیں اُن کا اصلی مطمح نظر معاشیات

واقتصادیات ہیں۔[۳]

حقیقت یہ ہے کہ مارکس اور اینگلس اپنے اس ترمیم شدہ ہمہ گیر نظریے کو کسی فلسفیانہ یا تجرباتی دلیل سے نہیں ثابت کر سکے ہیں لیکن ان کی مندرجہ بالا توضیح کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ دونوں بزرگ خود اِس بات کے معترف ہیں کہ مذہبی تصورات کی پیدائش کے اقتصادی حالات کے علاوہ کچھ دوسرے عقلی اور فطری اسباب ہوسکتے ہیں۔ وہ صرف اس بات کے مدعی ہیں کہ مذہب، اخلاق اور ایسے ہی دوسرے امور فقط اقتصادی اور معاشی حالت سدھارنے کی خاطر وجود میں آئے ہیں۔ ان کے وجود کی غرض اقتصادیات اور معاشیات کی اصلاح ہے۔ اگرچہ ان کا یہ دعویٰ کلیہ کے طور پر صحیح نہیں ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بہت سے مذہبی احکام اور قوانین کا مقصد یہ ضرور ہے کہ لوگ خوش حالی سے زندگی بسر کریں۔ وہ فقر اور تنگ دستی سے دوچار نہ ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ معاشرے کا ایک طبقہ خوب گل چھرّے اڑائے اور دوسرا نان شبینہ کے لیے محتاج ہو۔ مذہب معاشرے میں اقتصادی توازن اور اعتدال قائم کرنا چاہتا ہے لیکن یہ ایک کھلی ہوئی غلط فہمی ہے کہ خلط مبحث سے کام لیتے ہوئے بعض مذہبی احکام کے جو مقاصد اور فوائد ہیں انھیں اصل مذہب کے وجود میں لانے کا سبب قرار دے دیا جائے۔ سبب بھی ایسا سبب جس کے علاوہ کوئی دوسرا سبب نہ ہو۔

تمام آسمانی مذاہب وادیان کے بنیادی مقاصد کی تحقیق کیجیے۔ خصوصیت سے اسلام کے احکام وقوانین کا جائزہ لیجیے۔ یہ دیکھیے کہ اسلام نے امن وامان، صلح وسلامتی، عدالت وانصاف، خوش حالی اور فارغ البالی کی عام فضا پیدا کرنے کے لیے کیا کیا اقدامات کیے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ خداوند عالم کی طرف سے مخصوص ممتاز افراد کو مختلف اور گوناگوں مقاصد کے پیشِ نظر لوگوں کے درمیان بھیجا گیا۔ کہا جاسکتا ہے کہ سماج میں اقتصادی انصاف قائم کرنا انبیاء ومرسلین کے مقاصد میں سے ایک گراں قدر مقصد ہے۔ عوام کے مذہب کی طرف متوجہ ہونے کا ایک محرک یہ بھی ہے۔ بشریت کو مذہب کے گرویدہ ہونے سے جو فوائد پہنچے ہیں اُن میں سے ایک اہم، قابلِ لحاظ اور عظیم الشان فائدہ یہ بھی ہے۔

آخر خلط مبحث کیوں؟

واقعہ یہ ہے کہ مذہب کے بس دو سرچشمے ہیں۔ ایک انسانی فطرت اور دوسرے عقل وفکر۔

ایسے دونمایاں سبب ہونے کے باوجود اس کے کوئی معنی نہیں ہیں کہ صرف اٹکل سے سماجیات اور نفسیات کے بعض غیر یقینی اصولوں کی مدد سے خداپرستی کے اسباب بیان کیے جائیں۔

اگر بالفرض مادّہ پرستوں کے ایک جانے پہچانے طبقے کا یہ نظریہ صحیح ہوتو اس کا نتیجہ صرف یہ ہے کہ اس طویل تاریخ بشریت میں ہمیشہ ظالم اور طاقتور انسانوں نے مذہب سے غلط فائدہ اٹھایا ہے۔ انھوں نے اپنے ظالمانہ منحوس مقاصد کو پورا کرنے کا ذریعہ مذہب کو بنایا ہے۔ انھوں نے بہشت، حوروغلمان، دودھ اور شہدوں کی نہروں کا سہارا لے کر پوری پوری کوشش کی ہے کہ وہ غریب، مفلس، نادار، کمزور طبقے کو اپنے خلاف شورش اور بغاوت کرنے سے روکیں۔

ظاہر ہے کہ کسی عقیدے سے فائدہ اٹھانا ایک چیز ہے اور اس کے وجود میں آنے کا سبب ہونا دوسری چیز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مزدوروں کی بغاوتوں اور انقلابیوں کی آگ کو بجھانے کے سلسلے میں مذہب سے غلط فائدہ اٹھانا معلول ہے اس کی علت خود مذہب کا وجود ہے۔ اس کے کیا معنی ہیں کہ جو چیز مذہبی عقائد کی وجہ سے وجود میں آئی ہے اُسے خود اُن کے وجود میں آنے کا سبب قرار دے دیا جائے؟

میٹیریلزم صرف یہ کہتا ہے کہ مزدوروں اور کاشت کاروں کا طبقہ، زمین داروں اور سرمایہ داروں کی زیادتیوں کا شکار تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مزدور اور کاشت کار ہمیشہ دبا رہے۔ وہ سر نہ اٹھانے پائے۔ انھوں نے مذہب کے ذریعہ اپنے زیر اقتدار طبقے کے دل اور دماغ کو سن بنانا چاہا تاکہ ہر قسم کے انقلاب اور بغاوت کا دروازہ بند ہوجائے۔ میٹیریلزم کے علم بردار اس بات پر کوئی چھوٹی سی دلیل نہیں پیش کرسکتے کہ سرمایہ داروں اور تعلقہ داروں نے اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مذہب کو ایجاد کیا۔ یہ لوگ اس کے مدعی ہیں کہ کارگاہ عالم نوع انسانی کے مختلف طبقات کی جنگ کا میدان رہی ہے۔ مزدور اور کاشت کار پوری طاقت سے کوشش کرتے رہے ہیں کہ والیانِ ملک اور سرمایہ داروں کے شکنجۂ اقتدار کو توڑ ڈالیں لیکن ان کے دماغ میں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ وہ مذہب اور خداپرستی کے عقیدے سے ٹکّر لیں اور اس کی بیخ کنی کی کوشش کریں۔ حالاں کہ مزدوروں اور کاشت کاروں کو یہ نظر آرہا تھا کہ سرمایہ دار اور تعلق دار طبقے نے ان کی ہر تحریک کا سر مذہب کے ہتھوڑے سے کچلا ہے۔ وہ ہمیں مذہبی عقائد کی افیون کھلا کر بے حس اور بے عمل بنا دینا چاہتے ہیں۔ ہم عقلی طور سے یہ کہنے کے لیے مجبور ہیں کہ مذہب کے وجود میں لانے کے کچھ دوسرے اسباب ہیں۔ انھوں نے مذہبی عقائد کو لوگوں کے دل و دماغ میں

اس طرح جاگزیں کر دیا تھا کہ مزدور، کاشت کار، سرمایہ دار اور تعلق دار کوئی طبقہ اس کے لیے تیار نہ تھا کہ انھیں اپنی زندگی کی چار دیواری سے نکال دے اور وہ آزادی کی کھلی فضا میں سانس لے۔

ہاں اگر میٹیریلزم کے طرف دار یہ ثابت کر سکیں کہ پوری نوع انسانی میں سے صرف سرمایہ داروں اور زمین داروں نے پہلی مرتبہ غریب اور مفلوک الحال طبقے کی شورش کی آگ بجھانے کی خاطر خدا اور دوسرے مذہبی امور کا تصور اپنے ماحول میں پیدا کیا۔ پھر بے ہوش کر دینے والی دوا کے انجکشن کی طرح ان مذہبی عقائد کو جفاکش اور محنتی طبقے کے دل و دماغ میں پیوست کیا تو بے شک ایسی صورت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ خدا پرستی کا عقیدہ سرمایہ داروں اور تعلق داروں کے مفاد کو محفوظ رکھنے کے واسطے وجود میں آیا ہے۔

یہ نہ سہی تو مکتب مادّیت کے علم بردار اسے ثابت کریں کہ جب مزدور اور کاشت کار سرمایہ دار اور زمین دار طبقے کے شکنجۂ اقتدار میں گرفتار ہو گئے تو جفاکش اور محنتی گروہ نے اپنے ضمیر کو مطمئن بنانے کے لیے مذہب اور خدا پرستی کے تصورات اختراع کیے۔

اُن کا مقصد اپنی تسکین اور تسلی کا سامان فراہم کرنا تھا۔ ایسی صورت میں مادہ پرست طبقے کو یہ دعویٰ کرنے کا حق ہے کہ مذہب ایک کھلونا ہے جسے فقیروں اور تنگ دستوں نے اپنا دل بہلانے کے واسطے بنالیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مکتبِ مادیت ہرگز اس دعوی پر کوئی استدلال پیش نہیں کر سکتا۔ کوئی منصف مزاج مادہ پرست اس پر تیار نہیں ہو سکتا کہ حقیقت کے بجائے اس طرح کے گڑھے ہوئے افسانے کو تسلیم کر لے۔

میٹیریلزم کے حامی زمین و آسمان کے قلابے ملانے کے بعد اس سے زیادہ نہیں ثابت کر سکے ہیں کہ مال داروں نے غریبوں کو الجھانے اور ان کا دماغ زندگی کی حقیقی صورت حال سے ہٹانے کی غرض سے برابر مذہبی تصورات کا پروپیگنڈہ کیا۔ وہ طرح طرح سے کوشش کرتے رہے کہ دینی عقیدوں کے بازار میں برابر چہل پہل رہے، وہ سُونا نہ ہونے پائے۔ اس کی رونق دن دونی رات چوگنی بڑھتی رہے۔ اس خیال اور اِس بات میں بڑا فرق ہے کہ مذہبی تصورات کو سرمایہ دار طبقہ محض غریبوں کا دل بہلانے اور اُن کا ذہن بٹانے کی غرض سے وجود میں لایا ہے۔

اس طرح میٹیریلزم بس اتنا ثابت کر سکا ہے کہ ہر قسم کی محرومی اور مایوسی کے اندھیرے میں

گھرے ہوئے مفلوک الحال لوگوں نے مذہبی تصورات کے دامن میں اسی طرح پناہ لی جس طرح زندگی کی مشکلات سے تنگ آ کر بعض ناعاقبت اندیش افراد نشہ آور چیزوں کو استعمال کر کے ان میں اپنی تسکین اور تسلی کا سامان ڈھونڈھتے ہیں۔ غور کیجیے کہ کہاں یہ دعویٰ اور کہاں یہ بے سروپا ادعاء کہ فقیری اور تنگ دستی کی آگ میں جلنے والے طبقے نے اپنے افسردہ اور بجھے ہوئے دل کو بہلانے کے لیے خدا پرستی اور دوسرے دینی عقائد ایجاد کیے ہیں۔

براہ مہربانی دھوکا نہ کھایئے!

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دو چیزیں ہمیشہ ایک دوسرے کی ہم نشین اور ہم راہ ہوتی ہیں لیکن اس سے یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں علت و معلول کا رشتہ پایا جاتا ہے۔ اس ارتباط کا معیار صرف دو چیزوں کی ہم نشینی اور ہم راہی نہیں ہے۔ اس رابطے کے یقینی طور سے پائے جانے کے لیے اس خصوصیت کے علاوہ ایک دوسری خصوصیت کا موجود ہونا ضروری ہے۔ وہ اہم خصوصیت یہ ہے کہ دو چیزوں کو دیکھ کر عقل یقینی طور سے یہ فیصلہ کرے کہ وہ ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ ایک کے وجود پر دوسرے کا وجود موقوف ہے۔ ان میں سے جب ایک معدوم ہو تو دوسرا بھی معدوم ہو جائے گا۔ یعنی ایک کی ہستی پر دوسرے کی ہستی اور ایک کی نیستی پر دوسرے کی نیستی کا دارومدار ہے۔ بغیر اِس خصوصیت کا انکشاف کیے ہوئے یہ دیکھ کر کہ دو چیزیں بیک وقت موجود یا معدوم ہوتی ہیں یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ اُن میں سے کوئی کسی کا سبب ہے۔ ہمیں ہمیشہ یہ دکھائی دیتا ہے کہ جب سورج نکلتا ہے اور اُس کی روشنی پھیلتی ہے تو ہر صحیح وسالم آنکھ رکھنے والا شخص اگر کسی چیز کو دیکھنا چاہے تو دیکھ سکتا ہے۔ یقیناً یہ دونوں باتیں اگر کوئی رکاوٹ نہ ہو تو ہمیشہ ایک دوسرے کے ہم راہ اور ہم رکاب ہیں۔ کیا اس دائمی ہم راہی کو دیکھ کر کوئی صاحب عقل یہ کہہ سکتا ہے کہ آفتاب کے نور کا پھیلنا کسی شے کے دیکھنے کی علت ہے؟ کیا دیکھنا دیکھنے والے کا فعل نہیں بلکہ سورج کی روشنی پھیلنے کا فعل قرار پائے گا؟

عام طور سے آدمی کے ہاتھوں اور پیروں میں مجموعاً بیس انگلیاں ہوا کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہر تندرست آدمی میں جنسی خواہش بھی موجود ہوتی ہے۔ یہ دونوں باتیں عموماً ایک دوسرے کے ہمراہی ہیں۔ ہر شخص کو بھوک اور پیاس بھی لگتی ہے اور اسی کے ساتھ اُس کے ریڑھ کی ہڈی بھی ہوتی

ہے۔ کیا کوئی اس دائمی ہمراہی کو دیکھ کر یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ جنسی خواہش کے وجود کا سبب آدمی کے ہاتھوں اور پیروں میں بیس انگلیوں کا ہونا ہے یا چونکہ اُسے بھوک پیاس لگتی ہے اس لیے اُس کی پیٹھ میں ریڑھ کی ہڈی ہے؟

ان مثالوں کے برخلاف ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ جلتے ہوئے اسٹوو پر پتیلی ہے اور اس میں پانی بھرا ہے۔ اسٹوو پر پتیلی رکھتے ہی پانی نہیں کھولنے لگا۔ پہلے گنگنا ہوا۔ پھر جب اس کی گرمی ۱۰۰ درجے تک پہنچی تو وہ یکا یک کھولنے اور پھدکنے لگا۔ یہاں بھی یہ دو چیزیں ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہیں۔ پانی کی حرارت کا سو درجہ تک پہنچنا اور اُس کا کھولنا ایک دوسرے کے دائمی طور سے ہمراہ ہیں، لیکن یہاں عقل ان دونوں کے درمیان مفارقت کی خصوصیت کے علاوہ ایک دوسری خصوصیت کا بھی یقینی طور سے انکشاف کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ ان کے درمیان علت و معلول کا رشتہ بھی پایا جاتا ہے۔ سو درجہ تک پانی کی گرمی کا پہنچنا اس کے کھولنے کا سبب ہے۔ یہ رابطہ آنکھوں سے نظر نہیں آتا لیکن اس کی موجودگی کا فیصلہ عقل کرتی ہے۔

میٹیریلزم کے ماننے والوں نے ادیان و مذاہب کے وجود میں آنے کا سبب جن چیزوں کو قرار دیا ہے اُن کا شمار ابتدائی دو مثالوں کی لائن میں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بہت سے انسانی معاشروں میں مذہبی عقائد نیچر کی طاقتوں سے کائنات عالم میں پیش آنے والے حوادث کے نیچرل اسباب سے ناواقفیت اور معاشی فقر و تنگ دستی، اقتصادی بدحالی کے ہم راہ اور ہم رکاب رہے ہیں لیکن تیسری مثال کی طرح ایسا نہیں ہے کہ اُن میں سے کوئی دوسرے کے سبب سے وجود میں آیا ہو۔ مذہب کی پیدائش کا سبب تینوں میں سے کوئی نہیں ہے۔ وہ نہ نیچر کی بے رحم طاقتوں کے شکم سے پیدا ہوا ہے۔ نہ اُسے علل طبیعی سے جہالت نے جنم دیا ہے۔ اُس کو نہ سرمایہ دار وجود میں لائے ہیں اور نہ مزدوروں اور کاشت کاروں نے اپنی تسکین اور تسلی کی غرض سے ایجاد کیا ہے۔ مذہبی تصورات کا سرچشمہ انسان کی فطرت اور عقل ہے۔

ہمارے نظریے کی سب سے بڑی دلیل تاریخ کی دستاویز اور اس سے بڑھ کر ہمارا مشاہدہ ہے ہمیں ایسے معاشرے اور فلاسفہ نظر آتے ہیں کہ جو معاشی خوش حالی کے نقطۂ معراج پر ہیں۔ اس کے باوجود وہ مذہبی امور کے بارے میں انتہائی راسخ العقیدہ ہیں۔ اس کے سوا ایک دوسرا معاشرہ

اور دوسرے لوگ دکھائی دیتے ہیں جن میں جوں جوں اقتصادی اطمینان پیدا ہوتا ہے اُسی رفتار کے مطابق مذہب کے اثرات گھٹتے چلے جاتے ہیں۔ یونہی کسی سماج میں تنگ دستی اور فقر لوگوں کو کفر کی طرف کھینچتا ہے جب کہ وہی کسی دوسرے معاشرے میں لوگوں کے دل و دماغ کو مذہبی عقائد سے اجاگر بنا دیتا ہے۔

مذہب کی پیدائش کے سلسلے میں اگر مادہ پرستوں کے اِس خاص طبقے کا نظریہ صحیح ہوتو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی مال دار اور خوش حال آدمی کو دل سے نہ خدا کی بارگاہ میں سر جھکانا چاہیے اور نہ مذہبی احکام وقوانین کی رتّی بھر پابندی کرنا چاہیے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے دل و دماغ کے تمام گوشوں کو بالکل مذہبی عقائد سے خالی ہونا چاہیے۔ کیوں کہ مادّیین کا خیال یہ ہے کہ انہی سرمایہ داروں نے جفاکش اور محنتی طبقے کو بے ہوش بنانے کی غرض سے مذہبی عقائد کو گڑھا ہے۔ مادہ پرست اس کا کیا جواب دیں گے کہ آخر کیوں اور کس لیے صفحات تاریخ پر ایسے مال داروں کے نام نظر آرہے ہیں جنھوں نے خدا پرستی اور مذہبی احکام وقوانین کی نشر واشاعت کی راہ میں اپنی تمام دولت یا اُس کا بیشتر حصہ لٹا دیا؟ ایسے نمونے، صرف ہمارے زمانے میں نہیں دکھائی دیتے ہیں تاکہ مادّہ پرست ہمارے اس سوال کے جواب میں فوراً بول اٹھیں کہ امتداد زمانہ کی وجہ سے وہ خدا پرستی جو شروع شروع نمائشی تھی اُس نے رفتہ رفتہ سرمایہ دار طبقہ کے لیے مقدس شکل اختیار کرلی ہے۔ اِن نمونوں سے یہ نہیں سمجھا جاسکتا کہ جب شروع شروع مذہب نے جنم لیا ہے تب بھی دولت مند خدا کی راہ میں اسی طرح فراخ دلی سے روپیہ خرچ کرتے تھے۔ تاریخ ایک ایسی طاقت ور دوربین ہے جس کی وجہ سے بعید ترین گزشتہ زمانوں کا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے آسکتا ہے۔ اس میں کیا شبہ ہے کہ انبیاء ومرسلین خدا پرستی اور مذہب کے سب سے بڑے علم بردار تھے۔ ہمیشہ اُن کے گردوپیش ایسے گروہ نظر آتے رہے ہیں جنھوں نے پورے اخلاص اور لگن کے ساتھ اپنے جان ومال کو مذہبی عقائد کے اوپر قربان کردیا ہے۔ اگر مذہب کا تصور سرمایہ داروں کی اقتدار پسند ذہنیت سے خلق کیا تھا، اگر اس اختراع کا مقصد صرف یہ تھا کہ مزدوروں اور کاشت کاروں کو بے ہوشی کی دوا سنگھا کر سرمایہ دار اور تعلقہ داران کا خون اطمینان سے چوستے رہیں تو ہرگز تاریخ اِن دور ترین گزشتہ زبانوں میں ہماری آنکھوں کے سامنے یہ مناظر نہ پیش کرتی کہ مال دار طبقہ یہ جاننے کے باوجود کہ مذہب ایک ڈھکوسلا ہے جسے سرمایہ داروں نے غریبوں کو بے حس اور بے وقوف بنانے کے لیے گڑھا ہے اپنے قیمتی

اموال کو مذہب کی ترقی کے راستے میں تباہ و برباد کر ڈالے۔

نشر و اشاعت کا سبب ہے

کسی شاعر نے کہا ہے کہ

اے زر تو خدا نہ ای ولیکن بخدا
حلّال مشکلات وقاضی الحا جاتی

شاعر نے بڑی حد تک صحیح بات کہی ہے۔ یقیناً پیسہ اکثر و بیشتر دشواریوں کی گتھیاں سلجھا دیتا اور بہت سی ضرورتیں پوری کر دیتا ہے۔ کون انکار کر سکتا ہے کہ روپے کی طاقت سے مذہب کے جسم میں رُوح پھونکی جا سکتی، اس کے مقاصد کو پورا کیا جا سکتا، اس کے حلقۂ اثر میں وسعت پیدا کی جا سکتی ہے۔ کسی مسلک کو پھیلانے کے لیے ذرائع کا فراہم ہونا ضروری ہے۔ اس کی نشر و اشاعت کے لیے مرکز قائم کرنے پڑتے ہیں۔ اس پر کتابیں لکھوانا پڑتی ہیں، خوش بیان مقررین تیار کرنا پڑتے ہیں۔ مختلف قسم کے لوگوں کے خدمات حاصل کرنا ہوتے ہیں۔ ان میں سے کون سا کام بغیر پیسے کے ہو سکتا ہے؟

مذہب کے سلسلے میں غور و خوض سازگار ماحول چاہتا ہے۔ طبعی اور فطری میلانات اُسی صورت میں پھیلتے پھولتے اور پروان چڑھتے ہیں جب انسان کا دل و دماغ مطمئن ہو۔ یہ اطمینان اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب انسان کی بسر اوقات کے وسائل موجود ہوں۔ اس سلسلے میں وہ طرح طرح کی دشواریوں سے دوچار نہ ہو۔ جس طرح انتہائی خوش حالی انسان کو مذہب سے دور کرتی اسی طرح انتہائی پریشان حالی اور تنگ دستی بھی اُسے مذہب کے پاس نہیں آنے دیتی ہے۔

یہ بات مادّیین کے اس طبقے کے خیال کے بالکل برعکس ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فقر اور تنگ دستی نے دین اور مذہبی عقائد کو خلق کیا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ جب تک انسان کے پیٹ میں روٹی اور جسم پر کپڑا نہ ہو تو وہ ہرگز کسی بات کے متعلق غور و خوض کرنے پر اپنے دماغ کو آمادہ نہیں کر سکتا ہے۔

فقر انسان کی تمام طاقتوں کو مفلوج کر دیتا ہے۔ تنگ دستی کے بعد اُس کی صلاحیتوں کے سوتے سوکھ جاتے ہیں۔ اس کا نفسیاتی توازن بگڑ جاتا ہے۔ انسان ہمیشہ افسردہ اور نڈھال رہتا ہے۔ اُسے روٹی کے علاوہ کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی، وہ عام طور سے ایک نوالہ روٹی کی خاطر عزتِ نفس، غیرت

اور خودداری کے سرمایہ کو جلا کر راکھ کر ڈالتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان مال داروں سے انتقام لینے کے لیے بغاوت پر تیار ہو جاتا ہے۔ وہ مشتعل ہو کر آگ بگولا بن کر خشک وتر کو جلا دیتا، قتل وخوں ریزی لوٹ مار کا بازار گرم کر دیتا ہے۔ ان دو صورتوں میں سے جو بھی پیش آئے، چاہے انسان فقر وتنگ دستی کی آگ میں خاموش جلتا رہے اور چاہے ماحول میں انقلاب لانے کی غرض سے بغاوت کر بیٹھے۔ دونوں شکلوں میں مذہبی احساسات کا نمایاں ہونا بہت مشکل ہے۔

جب تک معاشرے میں خوش حالی، امن وامان، صلح وآشتی کا ماحول نہ ہو انسان کا خدا کی طرف متوجہ ہونا دشوار ہے۔ کم از کم یقین کے ساتھ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ جب لوگ اپنے ضروریاتِ زندگی کو اطمینان سے پورا کر رہے ہوں، جب ہر طرف امن وامان، صلح وآشتی، سماجی عدالت وانصاف کی فضا چھائی ہو تو مذہب کے نشو ونما اور اُس کے احکام کی پابندی کے لیے زیادہ مواقع فراہم ہیں۔

امیر المومنین علی ابنِ ابی طالبؑ کا نہج البلاغہ میں ارشاد ہے کہ "**لو تمثل لی الفقر لقتلته**" اگر فقر اور تنگ دستی آدمی کی صورت میں میرے سامنے آجائے تو میں اسے قتل کر دوں گا۔

فقیری اور تنگ دستی سے یہ غیر معمولی نفرت اور دشمنی کیوں ہے؟ مادّیین کے ایک مخصوص طبقہ کے بقول اگر وہ مذہب کا سرچشمہ ہے تو پیشوائے مذہب علی ابن ابی طالبؑ کو اُس کی بارگاہ میں سجدہ کرنا اور اس کی چوکھٹ پر پیشانی رکھنا چاہیے۔ لیکن مارکس، لینن، اسٹالن اور ان کے دوسرے ہم خیالوں کے نظریے کے برعکس سب سے بڑے مذہبی راہ نما حضرت علی ابن ابی طالبؑ فقر اور پریشان حالی کو مذہب کا دشمن قرار دے رہے ہیں۔ اُن کے نزدیک فقر قتل کر دینے کے قابل ہے جب تک وہ نیست ونابود نہ ہو۔ مذہب انسان کے دل ودماغ تک پہنچنے کے لیے راستہ ہموار نہیں ہو سکتا۔ مادّہ پرست طبقہ فقر کو مذہب اور خدا پرستی کا مبداء قرار دیتا ہے لیکن دنیائے مذہب کے راہ نماؤں کے عظیم ترین قائد پیغمبر اسلامؐ اسے کفر اور بے دینی کا سبب قرار دیتے ہیں۔ "**الفقر کادان یکون کفراً**" اکثر فقر وفاقہ انسان کو کھینچ کر منزل کفر تک لے آتا ہے۔

ظلم اور صریحی ظلم

بیسویں صدی کے مادّہ پرستوں نے صبر وتحمل کی بڑی بھیانک تصویر کھینچی ہے۔ انھوں نے اس

عظیم مذہبی تعلیم کا مفہوم مسخ کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ کون کہتا ہے کہ صبر کے معنی ہیں ہر قسم کی زیادتیوں کا برداشت کرنا۔ اپنے حقوق کو خاموشی سے پائمال ہوتے دیکھتے رہنا۔ ظلم کی تلوار کے نیچے اپنی گردن جھکا دینا۔ ظالموں کو ظلم کرنے کا موقع دینا۔ صبر کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں۔ کیا یہ حقیقتوں پر ظلم اور صریحی ظلم نہیں ہے کہ ان کو توڑ مروڑ کر لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ صبر کا مفہوم بڑا ہمہ گیر ہے، بلند مقاصد کے حاصل کرنے کے سلسلے میں ہر طرح کی سختیوں کے مقابل ثابت قدم رہنا صبر ہے، باطل سے جنگ کرنے میں استقامت سے کام لینا صبر ہے، ظالموں کے مقابلے میں سپر انداختہ نہ ہونا صبر ہے۔ بہادری اور جواں مردی کے ساتھ اُن کے سامنے ڈٹے رہنا صبر ہے۔ فرائض کے پورے کرنے میں جسمانی مشقتوں کا برداشت کرنا صبر ہے۔ خلافِ انسانیت کاموں کے پاس نہ پھٹکنا صبر ہے، تمام ایسی چیزوں سے دور رہنا جن کے متعلق شبہ ہو کہ وہ اس کے جسم یا اس کی روح کے فطری خصوصیات کے لیے مُضر ہیں، صبر ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ادیان و مذاہب اور عظیم المرتبت انبیاء کی تعلیمات ہمیشہ مظلوموں کی حامی رہی ہیں۔ انھوں نے کمزوروں کو سہارا دیا اور ہر دور کے فرعونوں، مزدوروں سے ٹکر لی، غریبوں اور مسکینوں کی پشت پناہی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرمایہ دار اور طاقتور طبقے نے ہمیشہ کوشش کی کہ قائدین مذہب اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہونے پائیں۔ صاحبان زور نے انھیں ڈرایا، دھمکایا، اُن کا مذاق اڑایا۔ انھیں لالچ دی اور ان کے ضمیر کو خریدنا چاہا۔ اُن کو جلا ڈالنے کے لیے آگ بھڑکائی اور منجنیق میں رکھ کر الاؤ کی طرف پھینکا۔ جادو کی طاقت سے اُن کے معجزات کو بے اثر بنانے کی ناکام کوشش کی۔ انھیں بخیال خود سولی دے کر ہلاک کرنا چاہا۔ ان کے جسم کو پتھر مار کر لہولہان کیا۔ ان کے سر پر کوڑا کرکٹ پھینکا۔ انھیں اُن کے وطن سے نکالا۔ اُن کے دوستوں اور عزیزوں کو ان کی آنکھوں کے سامنے تہ تیغ کیا۔ انھیں جوش کھاتے ہوئے تیل کی کڑھائی میں ڈال کر اُبال ڈالا۔ آرے سے کاٹ کر اُن کے جسم کے دو ٹکڑے کر ڈالے۔ یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ جو لوگ سرمایہ داروں اور طاقتور ظالموں کے خلاف ہمیشہ صف بستہ رہے ہوں، انھیں ان کا حامی اور پشت پناہ کہا جائے۔

مادہ پرستوں کا خیال ہے کہ تمام فلسفی افکار، تمام علمی نظریات، تمام شاعرانہ تخیلات، تمام سماجی آداب و رسوم، تمام مذہبی عقائد ہر زمانے کے اقتصادی حالات کی پیداوار ہیں۔ چوں کہ یہ حالات

بدلتے رہتے ہیں اس لیے کوئی چیز ثابت اور برقرار نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ مادّیین کا خود یہ دعویٰ ایک نظریہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ دعویٰ مارکس اور اینگلس کی ایک ذہنی اور فکری تراش ہے۔ اُسے بھی اُن کے خیال کے مطابق اُن کے زمانے کے اقتصادی حالات کا نتیجہ ماننا پڑے گا۔ ہرگز دائمی ابدی اور ناقابلِ تغیر نظریہ نہیں ہوسکتا۔ جن اقتصادی حالات نے اُسے پیدا کیا ہے جب وہ بدلیں گے تو خود بخود وہ اپنی جگہ دوسرے نظریہ کے لیے خالی کردے گا۔ وہ فنا ہوجائے گا اور دوسرا نظریہ اُس کا قائم مقام بن جائے گا۔

واقعتاً عیسائی راہ نما مجرم ہیں

اس تلخ حقیقت کا کیوں کر انکار کیا جائے کہ اکثر مسیحی راہ نما اور عیسائیت کے ٹھیکہ دار ہمیشہ سے سامراج کی تابع داری کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے مذہب کے ذریعے سرمایہ داروں کے ہاتھوں کو مضبوط کیا ہے۔ اُسے طاقتوروں کا پشت پناہ قرار دیا ہے۔ مذہبی عقائد کی چھری سے غریبوں اور کمزوروں کے گلے کاٹے ہیں۔ ماضی اور حال کی تاریخ نے ان کے جرائم کی فہرست تیار کی ہے۔ وہ اُن کی قابلِ نفرت کارستانیوں کو گواہی دے رہی ہے۔ مذہب پانی اور ہوا کی طرح انسانی زندگی کا سرمایہ ہے لیکن اسی پانی اور ہوا میں جب گندگی اور سمیت پیدا ہوجائے تو وہ بجائے زندگی اور تندرستی کے موت اور بیماری کا سبب بن جاتے ہیں۔ مذہب کو بھی جب اُس کے راستے سے ہٹا دیا جائے، اس کی آسمانی تعلیمات میں خود ساختہ باتوں کی آمیزش کردی جائے تو وہ لوگوں کو گمراہ کرتا، ان کے ذہنوں کو مسموم بناتا، خود غرض اشخاص کا آلۂ کار بن جاتا ہے۔ سرمایہ دار اس کی آڑ لے کر غریبوں کو دل کھول کر بیوقوف بناتے۔ وہ اس کے سہارے اپنے خلاف ہونے والی ہر بغاوت کا سر کچلتے ہیں۔

صدیوں سے کلیسا کے ذمہ داروں نے عیسائیت کو ظالموں کی پناہ گاہ بنا رکھا ہے۔ انھوں نے اپنے کرتوت سے مذہب کے دامن پر حمایت ظلم کا دھبہ لگا دیا ہے۔ مدتوں سے صاحب بصیرت لوگ یہ دیکھ رہے ہیں کہ مشرقی اور افریقی ملکوں میں پہلے عیسائی پادریوں نے اپنے مذہبی مرکز بنائے لیکن کچھ عرصے کے بعد انھیں سامراجی طاقتوں نے اپنی منحوس کارستانیوں کی آماج گاہ بنالیا۔ ظاہر میں گرجوں کی عمارتیں مذہبی عبادت گاہیں تھیں لیکن بعد میں انکشاف ہوا کہ ملک اور اہلِ ملک کے مفاد کے خلاف تمام

ذلیل منصوبے وہیں تیار کیے جاتے ہیں۔ان کے گہرے گہرے اندھیرے تہ خانے باہر سے بھیجے ہوئے ہتھیاروں سے پٹے پڑے تھے۔ پادریوں کے سفید مقدس معصومانہ لباس میں سامراجی ایجنٹ قومی اور وطنی اقتدار کا تختہ اُلٹ کر اپنے ولی نعمت طبقے کی حکومت کو اس کا قائم مقام بنانا چاہتے تھے۔

عیسائیت کے ضمیر فروش کرتا دھرتا اشخاص کے یہی شرم ناک کرتوت تھے جنھوں نے بعض مادہ پرست عناصر کو موقع دیا کہ وہ مذہب کے خلاف پروپیگنڈا کریں۔اسے ظالم سرمایہ داروں اور سامراجی طاقتوں کا آلۂ کار قرار دیں۔ بلکہ اس سے بڑھ کر یہ دعویٰ کریں کہ مذہب کو اسی نے خلق کیا ہے۔

کتاب ''مذہب در اتحاد جماہیر شوروی'' کے عجیب وغریب انکشاف کی طرف توجہ فرمایئے:

> روس کا شاہنشاہ گرجے کا رئیس تھا۔حکومت کلیسا کے ہاتھ میں تھی۔ پوپ اور پادری حکومت سے تنخواہ پاتے اور اُس کی خدمات انجام دیتے تھے۔ بغیر کلیسا کی رضامندی اور اجازت کے نہ کسی کو اسکول میں داخلہ ملتا اور نہ کوئی سرکاری ملازمت ملتی تھی۔ تمام پادری حکومت کے جاسوس تھے۔ جو لوگ پادری کے حضور میں اقرار کر لیتے کہ اُن کا رجحان جمہوریت کی طرف ہے ان کے ناموں کی فہرست حکومت کے پاس بھیج دی جاتی تھی۔ گرجا حکومت وقت کا آلۂ کار اور عیسائی راہ نما اس کے وفادار سپاہی تھے۔[۴]

ایسا نہ تھا کہ پوپ اور پادریوں کی مدد سے یورپ کے صاحبان اقتدار صرف غیر یورپین اشخاص کو اپنا غلام بناتے ہوں بلکہ انھوں نے خود یورپ کے لوگوں کے لیے بھی آزادی سے سانس لینا دشوار بنا دیا تھا۔ ان کے حقوق جس طرح چاہے پامال کیے جائیں لیکن وہ زبان نہیں کھول سکتے تھے۔ ضعیف الحال لوگوں کی کوئی پناہ گاہ نہیں تھی۔ کوئی ان کا مددگار اور ہمدرد نہ تھا۔ عام طور سے لوگ کلیسا کو حکام وقت کا آلۂ کار اور ان کے ہاتھوں کا کھلونا سمجھتے تھے۔ وہ یقین رکھتے تھے کہ پوپ اور پادری اقتدار اعلیٰ کے مفاد کے محافظ ہیں۔ وہ اس پر پوری قوم کے مفاد کو بھینٹ چڑھا دینے کے لیے تیار ہیں۔

کتاب ''آزادی فرد و دولت'' میں ذمہ داران کلیسا کے مقابلے میں یورپ کے لوگوں کی حالت کو ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے:

> ایک وقت تھا کہ یورپ میں سیاسی خود مختاری اپنے نقطۂ عروج پر تھی۔

بنیادی طور پر آزادی حکومت کا حق تھا۔عوام کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہاں کے لوگ خیال کرتے تھے کہ خدا کو ماننے کا تقاضا یہ ہے کہ حکومت کو اپنے افعال میں بالکل آزاد اور مطلق العنان سمجھا جائے۔عوام کو یہ عقیدہ رکھنا چاہیے کہ حکام وقت کے مقابلے میں کسی شخص کا کوئی حق نہیں ہے۔ باشندگان ملک کے سلسلے میں حکومت پر کسی قسم کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ہے۔لوگوں کا تصور تھا کہ خدا کو ماننے کا لازمہ یہ ہے کہ وہ سیاسی اور سماجی لحاظ سے بالکل آزاد نہیں ہیں۔آزاد رہنے کے معنی ہیں خدا کو نہ ماننا۔آخر میں انھوں نے خدا کے ماننے پر آزاد رہنے کو ترجیح دی۔[۵]

فرانس کے وزیر امور خارجہ نے بلاوجہ وہاں کی قومی اسمبلی میں یہ اعلان نہیں کیا کہ فرانس کے جو مذہبی راہ نما دوسرے ملکوں میں بظاہر عیسائیت کی تبلیغ کے لیے پھیلے ہوئے ہیں اُن کی مالی اور غیر مالی ہر طرح کی امداد کرنا ضروری ہے۔انھوں نے اسمبلی کے ممبران کو متوجہ کرتے ہوئے کہا:

اگر چہ فرانس اپنی سرحدوں کے اس پار بے دین ہے لیکن اُسے سرحدوں کے اُس پار پکا دیندار ہونا چاہیے۔اسی لیے جب ٹیونس میں تبادلۂ خیال کے لیے شمالی افریقہ کے مسیحی راہ نماؤں کی کانفرس ہونے لگی تو فرانس کے وزیر خارجہ نے ایک بڑی رقم اس کی تشکیل کے لیے دی۔[۶]

ان جیتے جاگتے شواہد کی بنا پر یہ کہنا یقیناً صحیح ہے کہ موجودہ عیسائیت عوام کے دماغوں کو سُن کر دیتی ہے۔انھیں بے حِس اور بے ہوش بنا دیتی بلکہ اس سے بڑھ کر کہا جا سکتا ہے کہ طاقت ور سرمایہ دار برسرِ اقتدار طبقے نے اُسے اپنے مفاد کے پیشِ نظر ایجاد کر لیا ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ بلاشبہ اصل مسیحیت اور جناب عیسیٰ کا آئین سچا دین اور آسمانی مذہب ہے۔ ہماری یہ گفتگو اُس مذہب کی پیدائش کے سلسلے میں ہے جسے کلیسا آج دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ جناب عیسیٰ کے لائے ہوئے دین میں تحریف کی گئی ہے۔اُس کی ابتدائی شکل وصورت اب باقی نہیں ہے۔اُس میں تبدیلیوں کے متعدد اسباب ہو سکتے ہیں لیکن سب سے زیادہ مؤثر اور طاقتور سبب یہی ہے کہ سرمایہ داروں اور برسرِ اقتدار لوگوں نے چاہا کہ مذہبی عقائد کے

ذریعے عوام کو بے حس اور بے ہوش بنادیں۔ اس کی خاطر انھوں نے مسیحیت کو مسخ کر دیا۔ توریت اور انجیل دونوں کے مرتب کرنے والے، یہودیت اور عیسائیت کے رسوم وآداب اختراع کرنے والے چاہتے تھے کہ سرمایہ داروں کو چین سے سونے کا سامان فراہم کر دیں۔ انھیں یہ اندیشہ نہ رہے کہ عوام کبھی اُن کے خلاف سر اٹھائیں گے۔ پوپ اور پادریوں کو اس سے مطلب نہ تھا کہ عوام کے حقوق پائمال ہوں گے۔ انھیں اپنا پیٹ بھرنے سے مطلب تھا۔

قرآن مجید نے انتہائی جرأت اور صراحت کے ساتھ جو وحیِ الٰہی کی امتیازی خصوصیت ہے ان ریاکار مذہبی رہنماؤں کے اس شرمناک کرتوت کو بے نقاب کیا ارشاد فرمایا:

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَـذَا مِنْ عِندِ اللّـهِ لِيَشْتَرُواْ بِهِ ثَمَناً قَلِيلاً فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُونَ.[۷]

ان لوگوں پر پھٹکار پڑے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب کو لکھتے اور پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ کتاب خدا کی طرف سے آئی ہے تا کہ اُس کے بدلے میں اُن کو کچھ مل جائے۔ وائے ہو اُن پر اُن چیزوں کی وجہ سے بھی جو انھوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھیں اور اُس حقیر معمولی عوض کے سبب سے بھی جسے انھوں نے حاصل کیا۔

دوسرے مقام پر اعلان کیا گیا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ إِنَّ كَثِيراً مِّنَ الأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللّهِ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلاَ يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ.[۸]

اے اہلِ ایمان آگاہ ہو جاؤ کہ یہ یہودی علماء اور عیسائی پادری جو تمہارے لیے یہودیت اور عیسائیت کی سوغات لائے ہیں غلط باتوں کے ذریعے لوگوں کی رقمیں کھاتے اور انھیں خدا کے راستے پر چلنے سے باز رکھتے ہیں،

اسی طرح جو اشخاص سونا، چاندی اکٹھا کرتے اور اسے راہ خدا میں خرچ
نہیں کرتے ہیں۔ انھیں تم دردناک سزاؤں کی خوش خبری دے دو۔

کلیسا کی بنیاد رکھنے اور اُس کی حمایت کرنے والوں نے شروع میں اپنی ساختہ پرداختہ مسیحیت کو اپنا پیٹ بھرنے کا ذریعہ بنایا۔ انھوں نے عوام کو بیوقوف بنابنا کر خوب خوب ان سے فائدے اٹھائے۔ پھر ایک قیمتی تحفے کی طرح اسے سامراجی طاقتوں اور ایسے طبقے کے سامنے جس کا کام ہی تھا قوموں کو اپنے شکنجۂ اقتدار میں گرفتار کرنا، ان کی گردنوں میں اپنی غلامی کا طوق ڈالنا، بے دردی سے اُن کا خون چوس کر اپنی پیاس بجھانا۔ ادب سے دونوں ہاتھوں پر رکھ کر پیش کیا۔ وہ سامراجی طاقتوں کا ہراول دستہ بن کر اجنبی ملکوں میں داخل ہوئے۔ جب بھی دوسرے ممالک میں دور سے عیسائیت کے مذہبی مبلغین کی دھندلی پرچھائیاں وہاں کے عوام کو نظر آتی تھیں تو وہ پیشین گوئی کر سکتے تھے کہ ان کے پیچھے سامراجی طاقتوں کا قہار عظیم اور ہر قسم کے ہتھیاروں سے لیس لشکر آ رہا ہے۔ ہندوستان، چین اور افریقہ کی تاریخ استعمار اس ناخوش گوار اور انتہائی کڑوی حقیقت کی زندہ اور طاقت ور گواہ ہے جس کا جھٹلانا ہر منصف مزاج شخص کے لیے بہت مشکل ہے۔

لیکن اسلام

اسلام فقر اور سامراج دونوں کا مخالف ہے۔ وہ کسی کی حق تلفی برداشت نہیں کرتا۔ وہ امن وامان، صلح وآشتی کا طرف دار، اپنے مخالفوں اور دشمنوں تک سے عدالت وانصاف کا حامی، کمزوروں اور بے نواؤں کا پشت پناہ ہے۔ اس کے باوجود اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ ظالم سرمایہ داروں اور سامراجیوں کا حمایتی ہے کھلا ہوا جھوٹ اور افتراء ہے۔ اسے استعمار پسند عناصر کی ایجاد قرار دینا حق کشی اور ناانصافی ہے۔

اسلام فقر اور تنگ دستی سے اس لیے جنگ کرتا ہے کہ اُس کے ہوتے ہوئے اسلام کے مقدس اور بلند مقاصد کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔ وہ ہلاکت اور پریشاں حالی کو اس لیے نیست ونابود کرنا چاہتا ہے کہ وہ دوسروں کی احتیاج اور مجبوری سے فائدہ اٹھانے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اسے سماجی ظلم اور بے انصافی جنم دیتی، وہ بلند انسانی اور اخلاقی اصولوں کے روند ڈالنے سے وجود میں آتی ہے۔ اسلام کا عظیم ترین

مقصد ہے ہر طرح کے ظلم کو دنیا سے مٹا دینا، عدل وانصاف کو ہر طرف پھیلا دینا، تمام انسانی اور اخلاقی اقدار کو محفوظ رکھنا۔ اسلام ہرگز اس کا روادار نہیں ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا طاقت ور کسی انتہائی کمزور شخص کے حق کا لحاظ نہ کرے۔ جو سماج کی نظر میں کمزور ہو وہ اسلام کے نزدیک طاقت ور ہے جب تک کہ وہ اُس کا حق دوسروں سے وصول نہ کر لے۔ جو لوگوں کی مادّی نگاہوں میں کسی بنا پر قوی ہو اُسے اسلام ضعیف سمجھتا ہے جب تک وہ اُس کے ہاتھ سے کسی کا حق نہ چھین لے۔ حضرت علی بن ابی طالبؑ اسلام کے عظیم ترین پیشوا تھے۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے کوئی بھوکا اور محروم ایسا نہیں دیکھا جس کے پہلو میں اس کا کوئی حق پائمال کیا ہوا نہ پڑا ہو۔

اسلام وہ مذہب ہے جو ظلم اور سامراج کے خلاف صرف خالی خولی پُر جوش نعرے نہیں لگاتا۔ فقط جوشیلی تقریریں نہیں کراتا اور بے مغز کتابیں نہیں لکھواتا۔ اس نے استعمار اور سماجی زیادتیوں کے خلاف مؤثر عملی قدم اٹھائے ہیں۔ اس نے ظلم اور حق تلفی سے دائمی جنگ کا اعلان کر دیا ہے۔ وہ کبھی ظالموں اور سامراجی عناصر کے ہاتھ میں ہاتھ نہیں دے سکتا۔ وہ سود خوری کا دشمن ہے۔ بعض خود غرض لوگ ایسا کرتے ہیں کہ جب وہ بھانپ جاتے ہیں کہ فلاں چیز بازار میں نایاب ہونے والی ہے تو وہ اُسے اِدھر سے فراہم کر کے اپنے پاس اس لیے ذخیرہ کر لیتے ہیں کہ جب وہ آنکھ میں لگانے کے لیے بھی نہیں ملے گی تو اُسے منہ مانگے داموں پر جس کے ہاتھ چاہیں گے فروخت کریں گے۔ اسلام کی قانونی زبان میں اس عمل کو ''احتکار'' کہتے ہیں۔ اس نے اس کے لیے بیوپاریوں کو آزاد نہیں چھوڑا۔ وہ اُس چیز کی خود عادلانہ قیمت معین کر کے انھیں اُس کے فروخت کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اسلام نے رشوت کی لین دین کو حرام قرار دے کر لوگوں کے حقوق کی حفاظت کی، اس نے تاکید کہ دوسروں کے مطالبات کو جلد از جلد ادا کرنے کی کوشش کرو۔ اس نے مال داروں کا فریضہ قرار دیا ہے کہ وہ فقیروں کی خبر گیری کرتے رہیں۔ حضرت امام جعفر صادقؑ نے آیت **وفی اموالھم حق للسائل والمحروم** کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ مال داروں کی دولت وثروت میں اسلامی قانون نے فقیر، حاجت مند اور محروم طبقے کا جو حق قرار دیا ہے وہ خمس وزکوۃ کے علاوہ ہے۔ ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اپنی استطاعت اور مقدرت کے مطابق ضرورت مند اشخاص کی مدد کرے۔ ہر روز یا ہر ہفتہ یا ہر ماہ انھیں کچھ نہ کچھ دے۔ دوسری جگہ قرآن میں ملتا ہے کہ **اقرضوا اللّٰہ قرضا حسناً** ''خدا کو قرضۂ حسنہ دو'' ظاہر ہے کہ خدا کو قرض لینے کی ضرورت

نہیں مطلب یہ ہے کہ اس کے بندوں میں سے جسے احتیاج ہو اُسے بلا پس وپیش خندہ پیشانی سے بغیر سود لیے قرض دو۔ اُس کی وقتی ضرورت پوری کرو۔ کچھ ممتاز افراد کی مدح کرتے ہوئے کہا گیا کہ **ینفقون سراً و علانیۃً** اُن لوگوں کا کیا کہنا جو کھلم کھلا اور چھپا کر خلق خدا کو اُن تمام نعمتوں سے فائدہ پہنچاتے ہیں جو خدا نے انھیں عطا کی ہیں۔

خمس وزکوۃ کے علاوہ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ صلۂ رحم کرے۔ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ جتنا بھی حسن سلوک کرسکتا ہے اس میں دریغ نہ کرے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے۔ **الذین یصلون ما امر اللّٰہ بہ ان یوصل**. یقیناً وہ اشخاص مدح کے قابل ہیں جو اُن چیزوں کو جوڑتے ہیں جن کے جوڑنے کا خدا نے حکم دیا ہے۔

اسلام سماج میں طبقات کے وجود کا مخالف نہیں لیکن ایمان اور عمل صالح کے علاوہ ان کے درمیان وجہ امتیاز کا قائل نہیں ہے۔ اسلام کا نعرہ ہے کہ جو شخص اس طرح رات گزار کر صبح کرے کہ اس کا پیٹ بھرا ہو دراں حالیکہ اس کا پڑوسی دن بھر بھوکا رہ کر رات کو بستر پر جائے اور تکیہ پر سر رکھے وہ مسلمان نہیں ہے۔ اسلام کی اس ہدایت میں انتہائی ہمہ گیری ہے۔ ایک محلے میں رہنے والوں کے لحاظ سے ایک گھر کا پڑوسی دوسرا گھر ہوتا ہے۔ اس سے بڑھ کر ایک محلے کا پڑوسی دوسرا محلّہ ہوتا ہے، ایک شہر کا پڑوسی دوسرا شہر ہوتا، ایک ملک کا پڑوسی دوسرا ملک ہوتا ہے۔

اسلام جب کہ دوسرے کی احتیاج اور مجبوری سے غلط فائدہ اٹھانے کا جانی دشمن ہے تو وہ استعمار اور سامراج کا طرف دار کیوں کر ہوسکتا ہے؟ چہ جائے کہ وہ اُس کی اختراع اور ایجاد ہو یا اس نے اسلام کا پروپیگنڈا کیا ہو۔ لوگوں کو اُس کا گرویدہ بنایا ہو کبھی کوئی عقل مند آدمی اپنے دشمن کی حمایت نہیں کرتا جس کے پاس تھوڑی سی بھی سمجھ ہو وہ ہرگز اپنے دشمن وجود میں نہیں لاتا۔ وہ لوگوں کو اپنے دشمن کا گرویدہ نہیں بنا سکتا۔

اسلام نے محدود مالکیت کے محضر پر دستخط کیے ہیں۔ اسلامی اقتصادیات کی عمارت محنت، پونجی، ذرائع پیداوار کی بنیاد پر بلند ہوئی ہے۔ ایسی صورت میں طبقاتی جنگ اس کے وجود کا سبب کیوں کر ہوسکتی ہے؟ اس کے بعد اسے غریب اور محروم طبقہ سرمایہ داروں کے خلاف آلۂ کار نہیں بنا سکتا۔ اسلام کے اقتصادی نظام میں محض شرائط کے ساتھ سرمایہ داری صرف یہی نہیں کہ ممنوع نہیں ہے بلکہ اسے اسلام

کی حمایت اور پشت پناہی حاصل ہے۔اس نے روپیہ کمانے اور دولت اکٹھا کرنے کے سلسلے میں جائز اور ناجائز راستوں کی تفریق کردی ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ ضروریات زندگی کو پیدا کرنے کے لیے منصفانہ کوششیں کی جائیں۔اس نے سماج کے فقیر اور حاجت مند طبقے کے کچھ حقوق قرار دیے ہیں اور اگر کوئی شخص جائز راستوں سے سرمایہ جمع کرے، اپنی کوششوں میں عدالت اور انصاف کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑے تنگ دست اور ضرورت مند لوگوں کے حقوق ادا کرنے میں کنجوسی سے کام نہ لے۔ظلم، مکاری، حق تلفی، سودخوری، بے جا ذخیرہ اندوزی کے پاس کبھی نہ پھٹکے تو اسلام کو کسی کے مال دار ہوجانے سے دشمنی نہیں ہے۔اتنا ہی نہیں بلکہ وہ قانونی طور سے ایسے شخص کا پشت پناہ ہے۔

اسلام طبقاتی جنگ میں کسی طبقے کا آلۂ کار نہیں بنتا۔ وہ ایک منصف مزاج جج کی طرح قانون کے سایے میں اس جنگ کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ وہ سماج کے تمام طبقات کو ان کے جائز حقوق دینا ضروری سمجھتا ہے۔اس سے بڑھ کر اُس کی آرزو ہے کہ معاشرے میں متضاد طبقات کا وجود ہی نہ رہے جن کے آپس میں ٹکرانے کا امکان ہو۔ وہ متمنی ہے کہ تمام افراد انسانی کے سروں پر لڑائی، کینہ، دشمنی، سامراج اور انتقام کے منحوس پرندے کے بجائے صلح وآشتی، امن وامان، یگانگی اور باہمی تعاون کا ہما چکر لگاتا رہے۔

ہم اس کے منکر نہیں ہیں کہ اسلام کو کسی طبقے نے کبھی آلۂ کار نہیں بنایا لیکن اُس کی تعلیمات اور اصول کا اصلی ماخذ قرآن مجید ہے جو ہر دور میں تبدیل وتحریف سے محفوظ رہا ہے۔اسی کی توضیح اور تفسیر راہ نمایان اسلام کے کلمات میں کی گئی ہے۔ روایت اور درایت کی ایسی کسوٹیاں اہلِ علم کے پاس موجود ہیں جن کی مدد سے پتا چلایا جاسکتا ہے کہ اُن بزرگوں کے زبان ودہن سے نکلے ہوئے ارشادات کون ہیں۔اور کن باتوں کو اُن کی طرف غلط طور سے منسوب کردیا گیا ہے۔ہم بہ آسانی بتاسکتے ہیں کہ ہر طرح کے ظلم اور حق تلفی کو نیست ونابود کرنے، سماجی عدل وانصاف کی فضا قائم کرنے کے سلسلے میں اسلام کی واقعی تعلیم کیا ہے؟ اسلام کسی قسم کی زیادتی کو برداشت نہیں کرسکتا۔ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ ظلم اور حق تلفی کرنے والا کون ہے؟ چاہے سرمایہ داروں کا طبقہ ظالم ہو اور چاہے کسانوں اور مزدوروں کا طبقہ۔اسلام یکساں طور پر دونوں سے برسرپیکار ہے۔محنت اور مزدوری کا سچا یا جھوٹا ٹھپّہ کسی طبقے کی پیٹھ پر لگ جانے سے اس کے واسطے یہ ہرگز جائز نہیں ہوسکتا کہ وہ دوسروں کو اپنے ظلم کا نشانہ بنائے، اُن کے حقوق کو پائمال

کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام سے سامراجی طاقتیں ہمیشہ ڈرتی رہی ہیں۔ اسلام نے کبھی اُن سے صلح نہیں کی۔ استعمار پسند عناصر نے علم اور فلسفے کے میدان میں اسلام سے ہمیشہ شکست کھائی ہے۔ اسی لیے اُن کا دل کینہ اور دشمنی سے بھرا ہوا ہے۔ انھوں نے اُسے نیست و نابود یا کم از کم اُسے کمزور یا مسخ کرنے کی اَن تھک کوشش کی ہے۔

سامراج کی ایک نہیں بہت سی شکلیں ہیں۔ سامراج یہی نہیں کہ کسی قوم کو براہِ راست یا بالواسطہ اپنا غلام بنالیا جائے۔ اُن کی زمین اُن سے چھین لی جائے۔ یہ بھی سامراج ہی ہے کہ پس ماندہ اور کمزور قوموں کو قدرت نے جو دولتیں عطا فرمائی ہیں ان پر سوفی صدی اُن کا تسلط نہ رہنے دیا جائے۔ اس سلسلے میں ان کو کسی طرح اپنے چشم و ابرو کے اشاروں کا پابند بنالیا جائے۔ یہ بھی سامراج ہی ہے کہ کسی ملک میں خود بہ خود ذہنی اور فکری انقلاب ہونے کا انتظار نہ کیا جائے بلکہ اس کے اندر برسرِ اقتدار طبقے کے مخالف عناصر کو اپنا مزدور بنا کر، اُن کے پاس کسی طرح ہتھیار پہنچا کر خونیں انقلاب کے ذریعے اپنے ہم نوا لوگوں کے ہاتھ میں حکومت دے دی جائے۔ یہ بھی انتہائی خفی اور نازک سامراج ہی ہے کہ علم اور عقل کی طاقت کو بے محل صرف کر کے سادہ لوح اشخاص کو گمراہ کر دیا جائے، مغالطہ انگیزیوں کا سہارا لے کر یہ ثابت کیا جائے کہ معاشی مشکلات کا حل بس فلاں اقتصادی نظام میں موجود ہے اُسے چھوڑ کر انسان کے لیے پریشانی ہی پریشانی، بدبختی ہی بدبختی ہے۔ سامراج کی ان تمام منحوس صورتوں کو ناکام بنانے کے لیے اسلام انسان سے کہتا ہے کہ **لا تجعل عبد الغیرک وقد جعلک اللّٰہ حراً.**
''اے انسان تو اپنے کو کسی دوسرے کا غلام نہ بنا، خدا نے تیرے جسم کو، تیرے وطن کو، تیری قدرتی دولتوں کو، تیرے ذہن اور دماغ کو آزاد خلق کیا ہے۔''

اسلام کے اوپر مختلف سنگ دل اور بے رحم دشمن قاتلانہ حملے کر رہے ہیں۔ ایک طرف سامراجی سرمایہ دار اسلام کے خلاف مورچہ سنبھالے ہیں۔ اگر کوئی شخص بھوکے بھیڑیے کے خونخوار پنجہ سے کمزور ہرن کو چھڑانا چاہے تو یقیناً بھیڑیا اس پر بُری طرح حملہ کر دے گا۔ سرمایہ داروں کا طبقہ اسی بھوکے بھیڑیے کے مانند اسلام پر حملہ آور ہو کر اُسے بے جان اور نڈھال کر دینا چاہتا ہے تاکہ اُس میں سکت نہ رہے کہ وہ اس کی انسانیت سوز حرکتوں کے خلاف آواز بلند کر سکے۔ دوسری طرف ان لوگوں کا مورچہ ہے جو اپنے کو کمزوروں کا حمایتی قرار دیتے ہیں۔ وہ اسلام کو سرمایہ داری کا مخلوق اور تابعدار کہہ کر

اس پر حملہ کرتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کا چمکتا ہوا سورج لوگوں کے سامنے نہ آئے۔ انھیں اس حقیقت کا علم نہیں کہ انھوں نے جس مقصد تک انتہائی خطرناک اور پیچیدہ طولانی راستوں کے ذریعے پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ اسلام انسان کو اُسی نقطے تک نہایت سیدھی، نزدیک اور بے خطر راہ سے پہنچا دیتا ہے۔

یہ جرم ہے اور بدترین جرم

لالچی اور خودغرض لوگ ہر چیز کو اپنا آلۂ کار بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُن کی نظر میں کسی چیز کی قیمت کا معیار یہی ہے کہ وہ کس حد تک اُن کے لیے کارآمد ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ علمی حقائق، اخلاقی اقدار، مذہب اور اس کے مقدسات کے ساتھ برابر غداری کی جاتی رہی ہے۔ ان سے غلط فائدہ اٹھایا گیا۔ اُن کو اپنے شخصی یا جماعتی مقصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ پانی، ہوا، نباتات، حیوانات، معدنیات مختلف موجودات کے دلوں میں چھپی ہوئی طاقتوں کو قدرت نے اس لیے پیدا کیا ہے کہ تمام انسان اُن سے آزادی کے ساتھ فائدہ اٹھائیں۔ وہ نوع انسانی کی مخلصانہ خدمت کریں۔ انھیں تعمیری کاموں میں صرف کیا جائے۔ خدا نے جن چیزوں کو نعمت بنا کر پیدا کیا انسان نے انھیں دوسرے انسانوں کے لیے مصیبت اور عذاب بنا دیا۔ اس بدسلیقہ انسان نے دوسری چیزوں کا کیا ذکر کریں خالق نے خود اُس میں جو صلاحیتیں ودیعت کی ہیں انھیں کب تعمیری کاموں میں صرف کیا؟ اُس نے عقل وفکر، احساس، ارادے کو غلط مقاصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا۔ اسی علم، قانون، عدالت، صلح اور اخلاق کے نام سے کیا کیا غلط فائدے اٹھائے جاتے ہیں، کیسے کیسے سنگین جرم، کیسی کیسی قابل نفرت غدّاریاں، مکاریاں اور زیادتیاں کی جاتی ہیں۔ بے شک مذہب کا اثر انسان کے دل ودماغ پر ہوتا ہے۔ وہ اُس کی رُوح کی گہرائیوں میں اُترا ہوا ہے۔ مذہب کو انسان محترم اور مقدس سمجھتا ہے۔ شاید یہی راز ہے کہ سب سے زیادہ مذہب کو غلط مقاصد تک پہنچنے کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ لیکن اس بال سے زیادہ باریک نکتے سے غفلت نہ کرنا چاہیے کہ صرف سامراج ہی کی شیطانی طاقتوں نے مذہب کو اپنا آلۂ کار نہیں بنایا۔ صرف ان ہی نے مذہبی عقائد کے ذریعہ عوام سے قوتِ احساس کو نہیں چھینا محض ان ہی نے اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے لوگوں کو بے وقوف بنا کر چپ نہیں کیا ہے بلکہ وہ طبقہ بھی تمام مذاہب سے عموماً اور اسلام سے خصوصاً اپنے

مقاصد میں کامیاب ہونے کے واسطے غلط فائدہ اٹھا رہا ہے جو اپنے کو مظلوموں کا حمایتی، مزدوروں کا ہمدرد، کاشت کاروں کا بہی خواہ قرار دیتا اور ہر طرح کے سامراج سے برسرِ پیکار ہونے کا نعرہ بلند کرتا ہے۔ اُس نے مسلمان ملکوں میں اپنے مخصوص نظریات کا پروپیگنڈا اُن پر اسلام کا جامہ چڑھا کر شروع کر رکھا ہے۔ وہ انھیں ''اسلام اشتراکیت'' کے لباس میں مسلمانوں کے سامنے پیش کر رہا ہے۔

اِس طبقے کا اصول ہے کہ حالات کے عارضی اور وقتی تقاضے بنیادی اصولوں پر مقدم ہیں۔ وہ نظریاتی طور پر مذہب اور دینی مظاہرات کا مخالف ہے لیکن اس کا خیال ہے کہ اساسی مقاصد تک پہنچنے کے لیے اگر مذہبیت کا نمائشی مظاہرہ کیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم مذہب کے دشمن نہیں ہیں۔ سامراجیوں نے تمھیں ہم سے دور کرنے کے لیے یہ پروپیگنڈا کر رکھا ہے کہ ہم نے مذہب پر پابندی عائد کر دی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ ہمارے زیرِ تسلط ممالک میں لوگوں کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ یہی دکھانے کے لیے کبھی مسلمان ملکوں کے نمائندوں کے سامنے اپنے یہاں کسی مسجد میں نماز جمعہ کرا دی جاتی، ہر سال کچھ لوگوں کو مکۂ معظّمہ حج کے لیے بھیج دیا جاتا، مختلف مسلمان ملکوں میں کبھی کبھار نمائشی علماء دین کا وفد دورہ کرتا نظر آتا ہے۔ معلوم ہوا کہ مذہب کو اپنے مقاصد کے سلسلے میں آلۂ کار بنانے کا جرم صرف سرمایہ داروں ہی کا طبقہ نہیں کرتا ہے۔ اس جرم کے مرتکب وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو مظلوموں کے ساتھ ہمدردی کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔

ان کے نزدیک تو اسلام خطرناک ہے

اسلام مظلوم ہے اور بہت مظلوم۔ اُس سے مختلف خود غرض گندم نما جو فروش غلط فائدہ اٹھانے کی برابر کوشش کرتے رہے ہیں۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ چوں کہ اسلام ظلم سے ٹکر لینے پر اپنے ماننے والوں کو ابھارتا ہے چوں کہ وہ ہر انسان کے یہ ذہن نشین کرتا ہے کہ وہ پیدائشی طور پر ہر باطل اقتدار کی غلامی سے آزاد ہے، چوں کہ اسلام ہر دور میں ایک عالم گیر انقلابی تحریک کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے وہ ان لوگوں کی پناہ گاہ ہے جو ہر قسم کے سامراج کی لعنت سے چھٹکارے کے لیے مقدس اور قابل قدر کوشش کر رہے ہیں۔ اسلام اُن کی ہمتوں کو بلند کرتا، ان کے دلوں میں جرأت پیدا کرتا، انھیں ظلم کے تہس نہس کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ یقیناً اسلام باطل پرستوں کے لیے خطرے کی گھنٹی ہے۔ اُس کی آواز

سیاہ اور سُرخ دونوں طرح کی سامراجی طاقتیں سن رہی ہیں۔ اِسی صدا نے ان کے بدن پر رونگٹے کھڑے کر دیے ہیں۔ مارے ڈر کے اُن کے دل کانپ رہے ہیں۔ اُن کے چہرے کا رنگ اڑ گیا ہے۔

سابق صدر امریکہ کینیڈی کی ایک کتاب کا ترجمہ فارسی میں ''استراتژی صلح'' کے نام سے ہو گیا ہے۔ اُس میں انھوں نے بتایا ہے کہ کن محرکات کی بنا پر ایشیا اور افریقہ کی قوموں نے سامراج کے خلاف بغاوت کی۔ کیوں اور کس لیے ان میں ہمت پیدا ہوئی کہ وہ ظالم طاقتوں سے آزادی کا مطالبہ کریں؟ اس مقام پر کینیڈی نے اعتراف کیا ہے کہ ایشیا اور افریقہ میں جو آگ لگی ہوئی ہے اُسے اس طرح نہیں بجھایا جا سکتا کہ وہاں کے لوگوں کے زبان و قلم پر پابندی لگا دی جائے۔ خصوصاً اگر یہ آگ کسی ایسے ملک میں بڑھکی ہو جہاں کے باشندوں کو اسلامی تعلیمات نے سیراب کیا ہو۔

جرمنی کی وزارت خارجہ میں مشرقی ممالک کے معاملات کی ایک ذمہ دار شخصیت نے فلسطین کے مفتی اعظم سے گفتگو کے ضمن میں صاف صاف کہہ دیا تھا:

> یورپین قوموں کا عقیدہ ہے کہ ان کے لیے کمیونزم سے زیادہ اسلام خطرناک ہے۔ لوگوں کی سطح زندگی بلند کر کے انھیں خوش حال بنا کر، ان میں سماجی عدل وانصاف پیدا کر کے انھیں اس قابل بنا کے کہ وہ اطمینان سے اپنے ضروریات زندگی پورے کر سکیں، کمیونزم کے خطرے سے ان کو بچایا جا سکتا ہے لیکن اسلام سے یورپ کے سمجھ دار باشندے بہت ڈرتے ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ فاسد تہذیب وتمدن نے اُن کے ڈھانچے کو بالکل بوسیدہ کر ڈالا ہے۔ اُن کی روحانیت اور اُن کے اخلاقیات کو کمزور بنا دیا ہے۔ اسلام ایک باغیانہ عقیدے کا نام ہے۔ اسلام ایک صحیح اور تندرست تمدن کا نام ہے۔ اسلام یعنی اخلاق اور روحانیت کا ایک مکمل دستور العمل ہے۔ یورپ کی صاحب اقتدار حکومتیں اس سے ڈرتی اور بہت ڈرتی ہیں۔ کہ جب شمالی افریقہ متحد ہو کر آزادی حاصل کر لے گا تو قدرتی طور پر دنیا میں اس کی ایک اہم اور باوقعت جگہ بن جائے گی۔[۹]

یہ صریحی اعتراف اُن لوگوں کا دندان شکن جواب ہے جو کہتے ہیں کہ اسلام مغربی سرمایہ داری

کا آلۂ کار ہے۔ ظالم، طاقت ور عناصر اور کمزور طبقے کے درمیان جو لڑائی چھڑی ہوئی ہے اُس میں کمزوروں کا سرا اسلام کے ہتوڑے سے کچلا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نہ سرمایہ داری کا مددگار ہے اور نہ کمیونزم کا۔ وہ ان دونوں سے بہ یک وقت برسرِ پیکار ہے۔ اسی لیے جس طرح ظالم سرمایہ دار اُس سے خائف ہیں اُسی طرح انتہا پسند کمیونسٹ۔ ایک طرف کارل مارکس نے اعلان کیا کہ مذہب سماج کے لیے افیون کی حیثیت رکھتا ہے۔ روسی دائرۃ المعارف اسلام کو ان لوگوں کا ساختہ پرداختہ قرار دیتا ہے جن کا کام ہے کمزوروں کا خون چوسنا، مزدوروں کی ضرورت اور مجبوری سے غلط فائدہ اٹھانا، دوسری طرف جرمنی کے ایک روزنامے کا مضمون نگار لکھتا ہے کہ سامراجی ذہنیت کے عناصر اسلام کے بارے میں کیا سوچتے ہیں:

> یہ صحیح ہے کہ اسلام اور تنہا اسلام افریقہ کی قوتوں کو کمیونزم کے خطرے سے بچاتا ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اسلام کا ان قوموں کے درمیان پھیلنا اور ترقی کرنا ہر کسی دوسرے خطرے سے زیادہ بڑا خطرہ ہے۔[۱۰]

حواشی

۱۔ دائرۃ المعارف روسی، ج:۱۸،ص:۳۱۶
۲۔ تاریخ نظریات سیاسی ج:۲:ص:۳۲۸
۳۔ تاریخی نظریات سیاسی، ج:۲،ص:۳۲۹
۴۔ کتاب مذکور،ص:۵
۵۔ کتاب مذکور،ص:۹۸
۶۔ دو مذہب،ص:۳۹
۷۔ البقرۃ،آیت:۷۹
۸۔ توبہ،آیت:۳۴
۹۔ روزنامہ تجدد (ایران) شمارہ۶
۱۰۔ ماہنامہ 'المسلمون' سال ہفتم،شمارہ۶

(ماخوذ از: اسلام اور عصرِ جدید، جلد:۹، شمارہ:۱،۲، جنوری، اپریل ۱۹۷۷ء)

محمد فہیم اختر ندوی *

خواجہ محمد گیسو دراز حسینی اور اسلامی علوم کی تدریس

اسلامی تاریخ میں عہد نبوی کے بعد جب بتدریج علوم کی شاخ در شاخ تقسیم ہونے لگی، اور سماج کے اہل علم اپنے ذوق اور رجحان کے مطابق علاحدہ علمی یا عملی وابستگی سے معروف ہونے لگے، تو عہد اموی میں اور عہد عباسی کے آغاز میں مختلف علوم وفنون اور سماجی خدمات کے میدان نمایاں ہوئے، جہاں ہر علم اور میدان کی اپنی مخصوص شناخت بنی، اس کے ماہرین تیار ہوئے، اس فن کی اپنی اصطلاحات اور تصنیفات تیار ہوئیں اور علاحدہ دائرۂ عمل متعین ہوئے۔

علمی ارتقاء کے اسی دور میں دیگر فنون کی طرح تصوف کا موضوع ممتاز ہوا اور صوفیاء کرام نے اپنی خدمات کے دائرے طے کیے۔ چنانچہ اس میدان میں ان کے افکار وآراء، ان کی اصطلاحات، طریقہ اصلاح وتربیت اور تعلیمی وتصنیفی خدمات سامنے آنے لگیں۔ ارتقاء کی اس تسلسل پذیر تاریخ میں صوفیاء میں دو رجحان فروغ پائے۔ ایک رجحان کے حامل صوفیاء نے عملی اصلاح وتربیت اور افراد کی تیاری پر توجہ مرکوز رکھی جبکہ دوسرا رجحان رکھنے والے صوفیاء نے تصنیفی اور تعلیمی خدمات میں دلچسپی لی اور افراد کے ساتھ کتابیں بھی تیار کیں۔

تصوف کی تاریخ میں پہلے رجحان کے حامل صوفیاء کی کثرت ملتی ہے جنھوں نے اپنی

* پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (حیدرآباد)

ریاضت ومجاہدہ کے ساتھ افراد کی تیاری وتربیت، ارشاد وہدایت اور تلقین وسلوک سے زیادہ اشتغال رکھا اور عوام الناس کی اصلاح وارشاد اور رواداری کے روشن نقوش قائم کئے۔ دوسرے رجحان سے وابستہ صوفیاء نے تعلیم وتدریس اور بالخصوص تصنیفی میدان میں نمایاں کارنامے انجام دئے اور ایسی کتابیں لکھیں جن سے ایک طرف صوفیانہ اشغال واعمال کی علمی بنیادیں فراہم ہوئیں اور اصلاح وتربیت کا عمدہ نصاب تیار ہوا تو دوسری جانب خالص علمی موضوعات پر قیمتی کتابیں لکھی گئیں، جن میں اسلامی عقائد، احکام وفرائض، قرآن کریم کی تفسیر اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اقدس بیان کئے گئے، اور ان کتابوں کی تدریس اور تعلیم کا اہتمام کیا گیا۔

علمی رجحان رکھنے والے صوفیاء کی وقیع اور طویل فہرست میں شیخ حارث محاسبی (۷۸۱-۸۵۷)، شیخ ابوالقاسم قشیری (۹۸۶-۱۰۷۲) ابونعیم اصبہانی، (۹۴۸-۱۰۳۸)، ابوحامد غزالی (۱۰۵۸-۱۱۱۱، سیدنا عبد القادر جیلانی (۱۰۷۵-۱۱۶۶، شیخ شہاب الدین سہروردی (۱۱۵۴-۱۲۳۴)، شیخ علی بن عثمان ہجویری (۱۰۰۹-۱۰۷۲)، اور خواجہ محمد حسینی گیسودراز (۱۳۲۱-۱۴۲۲) کے نام نمایاں ہیں۔[۱]

خواجہ محمد گیسودراز چشتی سلسلہ سے وابستہ صوفیاء میں اپنی علمی اور تصنیفی خدمات کے لئے ممتاز شناخت رکھتے ہیں۔ چشتی صوفیاء میں خواجہ بزرگ شیخ معین الدین اجمیری، قطب الدین بختیار کاکی، فرید الدین گنج شکر، محبوب الٰہی شیخ نظام الدین اولیاء اور خواجہ نصیرالدین محمود چراغ دہلی، یہ سب روحانیت وتقوی کے ساتھ ساتھ علم وفضل کے بھی اعلی مقام پر فائز تھے۔ شیخ نظام الدین اولیاء تو اپنے وقت کے بحاث کہلاتے تھے۔ آپ کے اساتذہ میں شمس الدین خوارزمی، علاء الدین اصولی، کمال الدین زاہد، برہان الدین بلخی اور امین الدین محدث جیسے باکمال ان وقت تھے۔ شیخ نصیرالدین محمود چراغ دہلی نے بھی علم وفضل کا بڑا مقام حاصل کیا تھا۔

سید محمد حسینی جو خواجہ محمد گیسودراز کے لقب سے اپنی حیات ہی میں مشہور ہوگئے تھے، اصلاً دہلی کے رہنے والے تھے۔ آپ کے والد سید یوسف حسینی اور آپ کے نانا سید علاء الدین، دونوں محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء کے مرید تھے۔ خواجہ محمد گیسودراز نے مکمل تعلیم حاصل کی اور وقت کے بڑے اساتذہ سے نصابی کتابیں پڑھیں۔ آپ کے اساتذہ میں مولانا سید شرف الدین کیتھلی، مولانا تاج الدین المقدم، اور قاضی عبد المقتدر کندی تھے۔[۲] گوکہ اس وقت خواجہ محمد گیسودراز اپنے مرشد شیخ نصیر

الدین محمود کی خدمت میں حاضر ہوکر علم باطن کی بھی تحصیل کررہے تھے اوران کی خواہش تھی کہ ظاہری علوم کی تعلیم اب چھوڑ دیں،لیکن مرشد نے انھیں حکم دیا کہ : " **ھدایہ ، اصول بزدوی ، رسالہ شمسیہ، کشاف ، مفتاح اور صحائف** تحقیق سے پڑھ لو،تم سے ایک کام لینا ہے۔"[۳] خواجہ محمد گیسودراز نے تمام درسی کتابوں کی تعلیم مکمل کی ،اور علمی کمال کے مقام تک پہنچ گئے۔مولانا عبدالحئ حسنی نے لکھا ہے:" **وکان عالما کبیرا**' ،اور "**تأھل للفتوی والتدریس.**"[۴] یعنی وہ بڑے عالم تھے اورفتوی وتدریس کی پوری اہلیت رکھتے تھے۔شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ:'' آپ سیادت، علم اور ولایت کے جامع اور بڑے رفیع الدرجہ،عظیم المرتبت اور قادرالکلام بزرگ تھے۔''[۵]

خواجہ محمد گیسودراز کی زندگی کا یہ وہ دور ہے جوان کی تعلیم وتربیت سے متعلق ہے،اسی دور میں وہ علم وفضل اور باطنی تربیت دونوں سے آراستہ ہوتے ہیں اور ظاہری علوم کی تعلیم اور علم باطن کی تحصیل دونوں مکمل کرلیتے ہیں۔آپ ۴ررجب ۷۲۱ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے، چار برس کی عمر میں والدین کے ساتھ دولت آباد چلے گئے ، جہاں کچھ عرصہ بعد آپ کے والد سید یوسف حسینی کا انتقال ہوگیا۔۷۳۶ھ میں والدہ کے ساتھ دوبارہ دہلی واپس آئے اور ۷۵۷ھ میں اپنے مرشد کی وفات کے بعد اصلاح وتربیت اور تعلیم وتصنیف کے لیے یکسو ہوگئے۔پھر ۸۰۱ھ میں دہلی سے نکل کر گجرات اور دولت آباد ہوتے ہوئے ۸۱۵ھ میں گلبرگہ پہنچے۔یہاں فیروز شاہ بہمنی کی حکومت تھی جس نے آپ کا شایان شان استقبال کیا۔قلعہ گلبرگہ کی جامع مسجد کے قریب خوبصورت خانقاہ میں اپنے کثیر التعداد مریدوں کے ساتھ آپ اصلاح اور تعلیم میں مشغول ہوگئے۔[۶] یہیں گلبرگہ میں آپ ۱۶رذی القعدہ ۸۲۵ھ میں ایک سو پانچ برس کی عمر پاکر انتقال کرگئے۔

تعلیم وتدریس اور تصنیف وتالیف کے ساتھ خواجہ محمد گیسودراز کی وابستگی بڑی گہری تھی۔اللہ نے آپ کو طویل عمر عطا فرمائی تھی۔اس عرصہ حیات میں آپ نے اصلاح وتربیت اور رشد وہدایت کا جو کارنامہ انجام دیا وہ تو جگ ظاہر ہے لیکن آپ کی تعلیمی اور تصنیفی خدمات بھی کافی مہتم بالشان ہیں۔تصنیفی کام آپ نے جس بڑے پیمانہ پر انجام دیا اور جن موضوعات پر کتابیں لکھیں ،اس کی مثال صوفیاء کی تاریخ میں بہت نایاب ہے۔سوانح نگاروں نے ذکر کیا ہے کہ خواجہ محمد گیسودراز نے مختلف علوم وفنون میں ایک سو پچیس کتابیں لکھیں۔[۷] سیر محمدی کے مصنف نے حضرت خواجہ گیسودراز کی تصنیفات کی فہرست میں ۳۶ کتابوں کے نام لکھے ہیں۔مترجم نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ ان کے علاوہ اور کتابیں بھی ہیں جو

مترجم کی نظر سے گذری ہیں۔ان میں بعض دکھنی اردو میں ہیں جو عوام کے لیے تصنیف کی گئی ہیں۔[۸]

آپ کی تصنیفات کے موضوعات خالص علمی ہیں اور علوم اسلامیہ کے تمام بنیادی موضوعات پر آپ نے کتابیں لکھی ہیں۔ یہ کتابیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ان سے بڑی تعداد میں لوگوں نے استفادہ کیا ہے۔علامہ عبدالحیٔ حسنی نے لکھا ہے کہ: " **لہ مشارکۃ جیدۃ فی الفقہ و التصوف و التفسیر وفنون اخری**"[۹] علوم اسلامیہ میں تفسیر کا موضوع سرفہرست ہے،حضرت خواجہ نے تفسیر کے موضوع پر تین کتابیں لکھیں۔ایک تفسیر قرآن جو' **الملتقط**' کے نام سے ہے،اوراب دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد سے طبع ہوچکی ہے۔یہ تفسیر قرآن سلوک کے رنگ میں ہےاور مصنف نے اس میں تفسیر کو تین زمروں میں تقسیم کیا ہے؛ حقائق، لطائف اور ملتقط۔ان میں بالترتیب تفسیر کے حقائق، صوفیانہ رموز اور مفسرین کے اقتباسات درج فرمائے ہیں۔[۱۰] دوسری تفسیر آپ نے عربی کی مشہور تفسیری کتاب' الکشاف' کے طرز پر لکھنی شروع کی تھی،لیکن اسے پوری نہ کرسکے۔سیر محمدی کے مطابق تقریباً پانچ پارے مکمل کر چکے تھے۔[۱۱] اور تیسری کشاف کے پانچ پاروں کے حواشی۔[۱۲] اسلامی علوم کا دوسرا اہم موضوع حدیث ہے۔حضرت خواجہ کے عہد میں ہندوستان میں حدیث کی مشہور نصابی کتاب علامہ حسن صغانی کی' مشارق الانوار' تھی۔حضرت خواجہ نے اس مجموعہ حدیث کی شرح لکھی جو صوفیانہ رنگ لیے ہوئے تھی۔نیز مشارق الانوار کا فارسی زبان میں ترجمہ بھی کیا۔[۱۳] تیسرا موضوع سیرت نبوی ہے،اس موضوع پر آپ نے رسالہ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم لکھی[۱۴] فقہ کے موضوع پر آپ نے **شرح الفقہ الاکبر** عربی اور فارسی میں لکھی۔اسی طرح **رسالہ استقامۃ الشریعہ بطریقۃ الحقیقۃ** لکھی۔[۱۵]

کتب بالا کے علاوہ تصوف کے موضوع پر متعدد کتابیں،ترجمے اور شروحات آپ کے قلم گہربار سے تیار ہوئے،جیسے عوارف المعارف (مصنف شیخ شہاب الدین سہروردی) کی شرح اور ترجمہ،رسالہ قشیری (شیخ ابوالقاسم قشیری) کی شرح،آداب المریدین (شیخ ضیاء الدین سہروردی) کی فارسی اور عربی شرح، نیز فارسی ترجمہ قوت القلوب (ابوطالب مکی) کے حواشی،ترجمہ رسالہ ابن عربی،شرح فصوص الحکم وغیرہ۔

تصنیفات کی اس کثرت اور موضوعات کے تنوع سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ علوم اسلامیہ کی تعلیم کے فروغ کے لئے خواجہ محمد گیسودراز نے کتنا زیادہ اہتمام کیا اور اس کے کس قدر اثرات مرتب ہوئے۔

خواجہ محمد گیسودراز نے فروغ تعلیم کے میدان میں صرف تصنیف پر اکتفانہیں کیا بلکہ آپ نے درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری کیا۔ چنانچہ آپ کے معمولات میں روزانہ تدریس بھی شامل تھی۔ آپ کے حلقہ درس میں علوم اسلامیہ کی اہم کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ سیر محمدی کے مصنف نے لکھا ہے کہ اشراق کے بعد آپ سبق پڑھانے میں مشغول ہوجاتے تھے۔علم تفسیر، حدیث، اور سلوک کا سبق آپ پڑھاتے تھے۔کبھی کبھی علم کلام اورعلم فقہ کا بھی سبق ہوتا تھا۔ بعدنماز ظہر تلاوت کلام پاک سے فارغ ہوکر بھی سبق ہوتا تھا۔اسی کتاب کے مطابق قاضی راجاتفسیر **الملتقط** پڑھتے تھے،سیداصغرکشاف پڑھتے تھے،اسی طرح شیخ زادہ شہاب الدین قوت القلوب پڑھتے تھے،مولانا ابوالفتح التعرف پڑھتے، ملک زادہ عزالدین آداب المریدین پڑھتے تھے۔ان کے علاوہ کافیہ، پنج گنج اورمصباح کا درس ہوا کرتا تھا۔[۱۶]

مصنف سیر محمدی ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''دو وقت سبق پڑھایا کرتے تھے، ایک چاشت کے بعد، دوسرا بعد نماز ظہر۔ تلاوت قرآن پاک کی فراغت کے بعد۔ زیادہ ترسبق علم تفسیر، حدیث، سلوک کے مضامین کا ہوتا تھا، اورکبھی علم کلام اور علم فقہ، اوراگرکوئی چیزتصنیف فرماتے تو **فئی الزوال** کے بعدلکھواتے تھے۔''[۱۷]

غرض کہ خواجہ محمد گیسودراز کی خدمات علوم اسلامیہ کی تعلیم اوراشاعت کے میدان میں مہتم بالشان ہیں اورآپ کی تصنیفات سے استفادہ اوران خدمات کا آج بھی تسلسل بنا ہوا ہے۔صوفیاء کرام کا وہ سلسلہ جہاں عملی تربیت وسلوک کے ساتھ علمی مشاغل سے وابستگی اورتصنیف وتالیف سے دلچسپی بھی رہی ہے اس کے افراد گوکہ کم ہیں، لیکن ان کے اثرات دیرپا اوردوررس ہیں۔ضرورت ہے کہ موجودہ وقت میں بھی صوفیانہ مراکز سے ایسی شخصیات اٹھیں جوعلم کی روشن شمع سے تربیت وسلوک کے پیکر کوتابناک بناتے رہیں۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ ان بزرگوں نے متعدد اہم کتابیں مختلف موضوعات پرتصنیف فرمائی ہیں۔شیخ حارث بن اسد محاسبی کی تصنیفات میں '**الرعایہ لحقوق اللّٰہ**' اور '**رسالہ المسترشدین**'، مطبوعہ ملتے ہیں۔دیگر کتابوں میں **کتاب التوھم**، **بدء من اناب الی اللّٰہ**، **آداب النفوس**' وغیرہ ہیں۔ابوالقاسم قشیری کی '**الرسالہ القشیریہ**' تصوف کے تعارف پرایک معروف ومستند کتاب ہے۔ابونعیم اصبہانی کی '**حلیة الاولیاء**' حوالہ کی کتاب سمجھی گئی ہے۔

امام غزالی کثیر التصانیف عالم ہیں، آپ کی 'احیاء علوم الدین، کیمیائے سعادت، اور مشکاۃ الانوار کے علاوہ فقہ، اصول فقہ، فلسفہ اور کلام میں متعدد کتابیں ہیں۔ سیدنا عبدالقادر جیلانی کی 'فتوح الغیب'، 'الفتح الربانی' اور 'الفیوضات الربانیه' وغیرہ تصنیفات ہیں۔ شیخ شہاب الدین سہروردی کی تصنیفات میں 'عوارف المعارف' بہت مشہور ہے، ان کے علاوہ 'اعلام الهدی'، 'رشف النصائح' اور 'بهجت الاسرار' ہیں۔ شیخ ہجویری کی تصنیفات میں 'کشف المحجوب' معروف و مشہور کتاب ہے، اس کے علاوہ 'منهاج الدین'، بحر القلوب، کتاب البیان لاهل العیان وغیرہ متعدد کتابیں ہیں۔

۲۔ دیکھئے علامہ عبدالحئ حسنی کی کتاب: الاعلام بمن فی الهند من الاعلام، جلد ۳، صفحہ ۲۷۷۔ دار ابن حزم، بیروت، ۱۹۹۹ء۔

۳۔ محمد علی سامانی، سیر محمدی، اردو ترجمہ سید شاہ نذیر احمد قادری، صفحہ ۱۹۔۲۰، سلسلہ مطبوعات سید محمد گیسو دراز اکادمی، گلبرگہ، ۱۹۸۴ء۔

۴۔ عبدالحئ حسنی، الاعلام بمن فی الهند من الاعلام، حوالہ سابق

۵۔ دہلوی، عبدالحق محدث، اخبار الاخیار، اردو ترجمہ مولانا سبحان محمود، صفحہ ۲۸۵، نور پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۹۰ء۔

۶۔ عبدالحئ حسنی، الاعلام بمن فی الهند من الاعلام، حوالہ سابق۔
شیروانی، ہارون خاں، دکن کے بہمنی سلاطین، اردو ترجمہ رحیم علی ہاشمی، صفحہ ۱۲۲، قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، ۱۹۹۸ء۔

۷۔ علامہ حسنی نے اپنے والد حکیم فخر الدین کی مہر جہاں تاب کے حوالے سے یہ تعداد لکھی ہے۔ دیکھئے: عبدالحئ حسنی، الاعلام بمن فی الهند من الاعلام، حوالہ سابق۔

۸۔ محمد علی سامانی، سیر محمدی، صفحہ ۱۱۶، حوالہ سابق۔

۹۔ عبدالحئ حسنی، حوالہ سابق، صفحہ ۲۷۷۔

۱۰۔ دیکھئے تفسیر الملتقط

۱۱۔ محمد علی سامانی، سیر محمدی، صفحہ ۱۱۴، حوالہ سابق۔

۱۲۔ عبدالحئ حسنی، الاعلام بمن فی الهند من الاعلام، حوالہ سابق۔

۱۳۔ عبدالجبار ملکاپوری، محبوب ذی المنن تذکرہ اولیائے دکن، صفحہ ۸۸۷، مطبع رحمانی، حیدرآباد۔
عبدالحئ حسنی، الاعلام بمن فی الهند من الاعلام، حوالہ سابق،
محمد علی سامانی، سیر محمدی، حوالہ سابق

۱۴۔ محمد علی سامانی، سیر محمدی، حوالہ سابق۔ عبدالحئ حسنی، الاعلام بمن فی تاریخ الهند من الاعلام، حوالہ سابق

۱۵۔ محمد علی سامانی، سیر محمدی، حوالہ سابق

۱۶۔ محمد علی سامانی، سیر محمدی، حوالہ سابق

۱۷۔ محمد علی سامانی، سیر محمدی، صفحہ ۲۹۔۹۳

ظفر دارک قاسمی *

ہندوستانی مذاہب پر مسلم علماء کا تحریری سرمایہ

مروج الذہب ومعادن الجوہر

ابوالحسن علی بن حسین المسعودی (۲۸۰-۳۴۵ یا ۳۶۴) کو عظیم محقق، تاریخ نویس اور جغرافیہ دان کی حیثیت سے دنیائے اہل علم جانتی ہے۔ یقیناً انھوں نے تاریخ وجغرافیہ اور دیگر سائنسی علوم وفنون پر انتہائی وقیع اور عالمانہ کام کیا ہے۔ ان کی کتابوں کا مطالعہ مصنف کی متنوع جہات اور علمی رتبہ وقد کو اجاگر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسعودی کو مشہور فرانسیسی مورخ ''فان کریمر'' عرب کا ''ہیروڈوٹس'' لقب دیتے ہیں۔ ان کی متعدد کتابیں ہیں، جن میں بہت ساری نایاب ہیں۔ لیکن مسعودی کی معلوم تالیفات کی فہرست درج ذیل ہے:۱- مقدمه التنبيه للاشراف۔ ۲- اخبار الزمان و حوادث عالم۔ ۳- كتاب القضايا والتجارب۔ ۴-ذخائر العلوم وماكان فی سلف الدهور۔ ۵-كتاب الرسائل۔ ۶-كتاب التاريخ فی اخبار الامم من العرب والعجم۔ ۷-كتاب خزائن الملك وسرالعالمين۔ ۸- كتاب المقالات فی اصول الديانات وغیرہ وغیرہ۔ مسعودی نے " اخبار الزمان و حوادث عالم "، "كتاب المقالات فی اصول الديانات "اور "مروج الذهب و معادن الجوهر " میں تقابل ادیان پر کافی بحث کی ہے۔ تفصیل سے اقوام کی خصال اور ان کے طریقۂ

* پوسٹ ڈاکٹریٹ فیلو، شعبۂ سنی دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ zafardarik85@gmail.com

عبادت واصنام پرستی کوقلم بند کیا ہے۔ان میں سے زیادہ معروف کتاب مسعودی کی 'مروج الذہب' کے نام سے ہے۔اس کوتاریخ مسعودی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔عموماً یہ تصور ہے کہ یہ کتاب تاریخ پر لکھی گئی ہے۔برعکس اس کے اگراس کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے یہ کتاب تقابل ادیان اور ہندشناشی کا بیش بہا خزانہ ہے۔اس کتاب کے اندر مصنف نے متعدد ادیان اور تہذیبوں کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ابوریحان البیرونی سے قبل تقابل ادیان پر انتہائی جامع نکات بیان کیے ہیں۔ضمناً یہ عرض کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آج مغرب کا یہ دعویٰ ہے کہ تقابل ادیان جیسے اہم شعبہ کو ہم نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔جب ہم ابن ندیم کی کتاب 'الفہرست' کا مطالعہ کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ بہت سارے مسلم مفکرین نے اس باب وشعبہ سے دنیا کو کافی پہلے متعارف کرادیا تھا اگرچہ وہ کتابیں منگولوں کے حملے میں ضائع ہوگئیں۔لیکن یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ تقابل ادیان پر اولین خدمت مسلم علماء کی ہے۔اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی مسعودی ہے۔اس نے اپنی کتاب ' مروج الذهب و معادن الجوهر' میں نہ صرف تقابل ادیان پر وقیع اور علمی بحثیں کی ہیں بلکہ دیگر اقوام وملل کی تہذیبوں اوران کی عادات وخصائل کو بھی نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے۔مسعودی کی اس کتاب کے متعدد زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں،جن میں انگریزی،فرانسیسی اور اردو سرفہرست ہیں۔اس کے علاوہ بلاد یورپ اور بلاد مشرق کی جامعات میں اس کتاب پر کافی تحقیقی مقالے بھی لکھے جاچکے ہیں۔اس وقت راقم کے سامنے جونسخہ ہے وہ اردو ترجمہ ہے۔کتاب کا اردو ترجمہ پروفیسر شادانی ایم اے نے کیا ہے۔اس کو نفیس اکیڈمی اسٹریچن روڈ کراچی نے ۱۹۸۵ء میں شائع کیا ہے۔اس کی پہلی اور دوسری جلد ۶۰۷ صفحات پر مشتمل ہے۔کتاب کے اردو مترجم نے مقدمہ تحریر کیا ہے جو نہایت اہم معلومات پر مشتمل ہے۔اب ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعض دیگر گوشوں پر گفتگو کی جائے۔

مروج الذہب کے قلمی نسخے

یہ بات آچکی ہے کہ یہ کتاب اصل عربی میں ہے۔چنانچہ ذیل میں یہ بتانا ضروری ہے کہ اس کے قلمی نسخے کہاں کہاں پائے جاتے ہیں اوران کی تحقیق وتدوین کس کس نے کی۔محققین نے اس کتاب کے چار قلمی نسخے دریافت کیے ہیں۔" مروج الذهب و معادن الجوهر "فرانسیسی نسخے سے عربی

میں ترجمہ یوسف اسعد داغز "معتمد دار الطباعت والاشاعت دار الاندلس، لبنان بیروت" نے کیا تھا، انھوں نے ایک قیمتی مقدمہ درج کیا جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مسعودی کی اس کتاب کے قلمی نسخے کہاں ہیں۔ "مروج الذھب و معادن الجوھر" کا اولین نسخہ پیرس کے شاہی کتب خانے میں تین جلدوں کی صورت میں موجود تھا۔ اسی نسخے کو فرانسیسی زبان میں منتقل کرنے سے قبل ایک جلد میں مرتب کیا گیا۔ اسی نسخہ کا ذکر موسیو رینو نے اپنی فہرست مخطوطات میں نمبر ۱۴۷۷ کے تحت درج کیا ہے۔ اس فہرست کے مطابق اس کی کتابت کی تکمیل ۷۰۸ء میں ہوئی۔ یوسف اسعد نے دو نسخوں کا اور ذکر کیا ہے لیکن ان کی تفصیل یہاں ترک کرتے ہیں۔ البتہ چوتھے نسخہ کے متعلق لکھا ہے کہ موسیو رینو کی فہرست اندراج کے مطابق حروف تہجی (د) کے تحت درج کیا ہے۔ اور اس کو ایشیائی سوسائٹی کی ملکیت بتایا ہے۔ اس نسخے کی کتابت ہبۃ اللہ بن محمد بن علی بن حسین القرشی نے ۵۹۱ھ تک تکمیل کی ہے۔ یوسف اسعد داغز کی تحقیق کے مطابق یہی نسخہ قابل اعتبار ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس میں اکثر مقامات وہ ہیں جنہیں 'مروج الذہب ومعادن الجوہر' کے مؤلف نے ہندوستان کے مشہور شہر بنارس میں اور خراسان (ایران) میں لکھا ہے۔[1]

مسعودی، ادیان وثقافتوں کا شناور

مسعودی نے اپنی کتابوں میں جن تہذیبوں اور ادیان کی تحقیق وتفتیش کی ہے وہ صرف دوسری کتابوں ومصادر کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اس نے مختلف ممالک اور شہروں کا سفر کیا اور وہاں کے حالات سے از خود واقفیت حاصل کی اور دس سال کی محنت شاقہ کے بعد مروج الذہب جیسی اہم کتاب تصنیف کی۔ یوسف اسعد داغز اپنے عربی ترجمہ میں مسعودی کے اسفار اور سیر وسیاحت کا تذکرہ کرتے ہیں۔

تیسری صدی شروع ہوتے ہی وہ سیر وسفر کی طرف مائل ہوا۔ اور دنیا کی سیاحت کے لیے نکل کھڑا ہوا، پہلے ملتان گیا، وہاں سے شہر منصورہ پہنچا اور اس کے اطراف وجوانب کی تین سال کی مدت سیاحت کے بعد، بلاد فارس کی طرف روانہ ہوا اور کرمان وغیرہ دیکھتا ہوا پھر ہندوستان کی طرف پلٹا اور کمبا وسیمور کے شہروں میں تھوڑے عرصے قیام کرتا ہوا جزیرہ سراندیپ گیا، پھر وہاں سے بحری سفر کرتا ہوا کمبا کو اور مدغاسکر گیا اور وہاں سے عمان جا نکلا۔ اسی طرح وہ کچھ دن ملیشیا میں بھی رہا اور پھر بحری راستے

سے چین گیا اور ان سب جگہوں پر خطیر معلومات سے متمتع ہوتا ہوا بحر احمر یا بحر قلزم کے مشرقی سواحل سے گزرا اور جنوب میں بحر قزوین کو بھی دیکھا۔ اس کے بعد اسلامی ممالک کا رخ کیا تا کہ اپنی لامحدود سیاحت اور سفر کے حالات و واقعات کو قلم بند کر سکے۔ اس کے احوال سفر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ۳۱۴ میں فلسطین کے شہر طبریہ کا بھی سفر کیا، پھر وہاں سے انطاکیہ کے علاوہ شام کے شمالی حصوں کی برسوں سیر کی اور وہاں سے ۳۳۲ میں بصرہ پہنچ کر اپنی تصنیفات و تالیفات کو تدوین و ترتیب کے زیور سے آراستہ کیا۔ اسی دوران اس نے اپنی اہم اور نادر تصنیف مروج الذہب کو صفحہ قرطاس کیا۔[۲]

مذکورہ اقتباس کی روشنی میں یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسعودی کو ادیان و اقوام کی تہذیب اور ان کے احوال کو جاننے کا کافی شوق تھا۔ اسی غرض سے اس نے مختلف ممالک اور شہروں کا دورہ کیا، وہاں کی آب و ہوا کو سمجھا اور اقوام کی نفسیات اور بود و باش کی تحقیق کی۔ ان کی عبادت و پرستش کے مسائل سے واقفیت حاصل کی۔ ملکوں اور قوموں کے سیاسی، سماجی اور معاشی صورت حال کو قریب سے دیکھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنی اس کتاب میں، چین، ہندوستان، عرب، جیسے ممالک کا مشاہدہ کر کے ان کی دینی اور اخلاقی حیثیت کو پیش کیا ہے۔ اس وجہ سے مسعودی کی اس کتاب کو تقابل ادیان اور مطالعہ تہذیب پر دستاویزی حیثیت کی حامل قرار دیا جا سکتا ہے۔

کتاب کے مباحث

ذیل میں ان مباحث کو پیش کرنا مقصود ہے جن میں ادیان و مسالک پر بحث کی ہے۔ چنانچہ مصنف نے کتاب کے دوسرے باب میں موضوعاتی فہرست درج کی ہے۔ کتاب کے جملہ مضامین ۱۲۲ بتائے ہیں۔ جن میں سے چند کا ذکر کرنا یہاں مقصود ہے۔

۱- ہندوستان اور دوسرے ممالک کے حالات و کوائف، وہاں کی سیر و سیاحت اور عبادات سے متعلق وہاں کے باشندوں کی رائیں۔ ۲- چینی و ترکی سلاطین، ان کے حالات و کوائف اور سیاست کا ذکر۔ ۳- سریانی سلاطین۔ ۴- ملوک موصل و نینوا۔ ۵- ملوک بابل۔ ۶- فارس کے اولین بادشاہ، ان کی سیرت وغیرہ۔ ۶- ملوک الطوائف جو اشغانی کہلاتے ہیں ۸- ساسانی سلاطین، ۹- ملوک یونان اور ان کے حالات۔ ۱۰- ہندوستان میں سکندر کی لڑائی کا حال، ۱۱- سکندر کے بعد یونانیوں کے حالات۔ ۱۲-

روم کے احوال اوران کی تاریخ وسیرت قومی۔۱۳-سوڈان، وہاں کی نسلیں وغیرہ وغیرہ۔گویا مضامین کتاب اس بات پر شاہد ہیں کہ مسعودی نے تقریباً اس وقت پوری دنیا کے احوال اورادیان وتہذیب کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

اس وقت راقم ہندوازم پر مسلم علماء کی خدمات کوقلمبند کررہا ہے۔لہٰذا دیگرادیان وتہذیب کو نظرانداز کرتے ہوئے ہندوستان اور یہاں کے احوال کے متعلق مسعودی کے افکار جاننے کی کوشش کریں گے۔

ہندوستان کاعلمی مقام

ہندوستان کے متعلق مسعودی نے انتہائی اہم معلومات اپنی کتاب ''مروج الذہب ومعادن الجوہر'' میں فراہم کی ہیں۔

چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ:

> ''اہل ہند ابتدائے کائنات اورتخلیق موجودات عالم کے بارے میں اپنے جداگانہ مخصوص نظریات رکھتے ہیں۔ان کے اولین سات حکماء کی آراء میں تضاد ہونے کے باوجود پانی سے ابتدائے کائنات کے سلسلے میں سب متفق ہیں۔قدیم حکمائے ہند کی رائے میں دنیا کی قدیم ترین سرزمین، سرزمین ہند ہے جہاں سے کوہ صحراو جنگلات اور جملہ حیوانات کی ابتدا ہوئی ہے۔ کائناتی علوم پر تحقیق وجستجو کے سلسلے میں ان کے پیش کردہ نتائج سے بحیثیت علمی کسی کو اتفاق ہو یا نہ ہولیکن ان کی تحقیقی کاوشیں قابل غور وفکر ضرور ہیں۔ ان کے نزدیک ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام پہلی بار انہی کی زمین پر اترے تھے۔ان کے خیال میں علمی قدامت کے لحاظ سے ارض ہند قدیم ترین ہے۔وہیں کی کانوں سے لوہا اور جواہرات نکلے ہیں۔ہندوستان کا پہلا بادشاہ برہمن نسل سے ہوا تھا۔اسی کے دور میں کانوں سے لوہا نکالا گیا جس سے آلات حرب تیار کیے گئے۔اسی کے زمانے میں منادر تعمیر کیے گئے

جنہیں چمکتے دمکتے مشرقی جواہرات سے سجایا گیا۔ان منادر میں کواکب کے بارہ برجوں کے نقشے اور انسانی وحیوانی مجسمے تیار کر کے رکھے گئے اور دیواروں پر ان کے نقش ونگار ابھارے گئے۔اہل ہند کا مدبر اعظم شمس نامی ایک شخص تھا جس نے مسائل کائنات پر اپنی ایک کتاب میں کچھ عام فہم اور کچھ خواص کے لیے علمی زبان میں بحث کی ہے۔حکماء ہند نے اسی کے زمانے میں اجتماعی طور پر کتاب ''السند ہند'' (واضح رہے کہ رجال السند والہند کے نام سے ایک اہم ترین کتاب قاضی اطہر مبارک پوری نے تصنیف کی ہے۔) اور اس کی شرح ''دہر الدھور لکھی ہے۔اسی زمانے میں مجطی کی کتاب ''الارجہید الارکند'' اور بطلیموس کی طرز پر دوسری کتابیں لکھی گئیں۔انہیں دو کتابوں سے اہل ہند میں علم ہندسہ اور ریاضی کے ان نو قاعدوں کی ابتدا ہوئی جو ہندوستان سے مخصوص ہیں۔ہندوستان کا پہلا شخص شمس ہی تھا جس نے آفتاب کی بلندی کی نشاندہی کی اور یہ بتایا کہ سورج اپنے ہر برج میں تین ہزار سال رہتا ہے۔اور پورے آسمان کی مسافت ۳۶ ہزار سال میں طے کرتا ہے۔اس کے حساب کے مطابق ہمارے زمانے میں اس وقت یعنی ۳۳۲ ہجری میں سورج کا قیام برج ثور میں ہے۔اس کا سفر آسمان میں جنوب سے شمال اور شمال سے جنوب کی طرف ہوتا ہے۔اس نے عناصر اور اس کے ضعف وتوانائی پر بھی گفتگو کی ہے''۔[۳]

یہ بات تو طے ہے کہ سرزمین ہند ابتدا ہی سے تہذیب وثقافت اور علم وفن کی بہترین آماجگاہ رہی ہے۔یہاں ہر دور میں اصحاب علم وفضل پیدا ہوتے رہے ہیں جنھوں نے ہندوستان کی علمی طور پر پوری دنیا میں شناخت وامتیاز بنائی ہے۔مسعودی کی درج بالا معلومات بھی اسی کا حصہ ہیں۔ان تمام چیزوں کا مسعودی نے مشاہدہ کیا اور اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں ان حقائق کو قلم بند کیا ہے۔

ہندوستان کا سیاسی نظام

مسعودی کی تحقیق کے مطابق ہندوستان کا پہلا بادشاہ برہمن نسل سے تھا،اس کے متعلق اہل

ہند کی آراء متضاد ملتی ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ ابوالبشر آدم علیہ السلام تھے اور بعض کا خیال یہ ہے کہ وہ بادشاہ ہی تھا۔ پہلے بادشاہ (برہمن) کے ہلاک ہوجانے کے بعد اہل ہند نے حد درجہ گریہ وزاری کی اور اس کا جانشیں اس کے سب سے بڑے بیٹے باہور کو بنایا جس کے لیے اس کا باپ پہلے ہی کہ گیا تھا۔ سیرت کے لحاظ سے وہ اپنے باپ کی طرح تھا۔ اس نے حکماء کی بڑی توقیر کی بلکہ ان کے جاہ وحشم میں اضافہ کیا اور انہیں اہل ہند کو حکمت کی تعلیم دینے پر مامور کیا اور خود انہیں بھی علم وحکمت میں مزید تحقیق کا حکم دیا، اس نے اپنے مذہبی عقائد کے مطابق بہت سی نئی عبادت گاہیں تعمیر کرائیں۔ جب وہ ہلاک ہوا تو اس وقت اس کی عمر سو سال تھی۔ اسی کے زمانے میں پانسہ پھینکنے کا رواج ہوا۔ باہور کے بعد زامان تخت نشیں ہوا، اس کی حکومت تقریباً ۱۵۰ سال پر محیط تھی۔ فارس اور چین کے بادشاہوں سے اس کی متعدد جنگوں کا ذکر علماء نے کیا ہے۔ اس کے بعد فور (پورس) مسند سلطنت پر متمکن ہوا اسی سے سکندر کی جنگ بھی ہوئی تھی۔ سکندر نے اسے شکست دے کر قتل کر دیا تھا اس وقت اس کی حکومت کے ۱۴۰ سال گزر گئے تھے۔ اس کے بعد بشلیم بادشاہ ہوا جس نے کتاب کلیلہ و دمنہ لکھی ہے۔ جسے ابن مقفع سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جس کے بہت سے افسانے وغیرہ عباسی خلیفہ المامون کے کاتب سہل بن ہارون نے اپنی کتاب ''ثعلہ وعضرہ'' میں ترجمہ کر کے پیش کیے ہیں نیز ان پر کچھ اضافے کر کے کتاب کی منظومات میں مزید حسن پیدا کر دیا ہے۔ اس کی حکومت کی مدت تقریباً ۱۲۰ سال ہے۔ پھر اس کے بعد بلہت ہندوستان کا راجا بنا۔ اس نے شطرنج کے کھیل کو ایجاد کیا۔ اس کا دور حکومت صرف ۳۰ سال ہے۔ بلہت کے بعد کورش ہندوستان کا بادشاہ ہوا۔ اس نے معاشرتی اصلاحات کے علاوہ مذہبی روایات میں بہت ساری اصلاحات کیں اور اپنی رعایا کی بہت سی سماجی ومعاشی تکالیف رفع کرنے کا باعث بنا۔ کورش ہی کے زمانے میں سند باد بھی تھا، جو اس کا مشیر تھا۔ اسی نے کورش کے لیے سات وزراء، معلمین، غلام اور بیویوں کی تعداد کے سلسلے میں ایک کتاب مرتب کی تھی جس کا نام بھی اس کے نام پر سند باد ہی تھا۔ اس نے کورش کے لیے جو سب سے بڑی کتاب لکھی تھی وہ مختلف امراض کے اسباب وعلل اور ان کے علاج کے لیے دواؤں کی تجاویز وغیرہ پر مشتمل تھی۔ اس میں جسم انسانی کے مختلف اعضاء اور ان کی کارکردگی کے سلسلے میں اشکال وتصاویر دی گئی تھیں اس بادشاہ کی عمر اس کے انتقال کے وقت ۱۲۰ سال تھی۔ آگے مسعودی نے لکھا ہے کہ اس کے بعد اہل ہند اختلاف کے شکار ہو گئے اور لوگوں

نے مرکز سے الگ الگ اپنی حکومتیں قائم کرلیں۔ سندھ کی الگ، قنوج کی الگ حکومت قائم ہوئی۔ کشمیر کی الگ حکومت قائم ہوئی۔ سب سے بڑی حکومت کا پایہ تخت شہر 'مانکیر' تھا۔[۴]

پتہ یہ چلا کہ ہندوستان کا قدیم زمانے سے ایک منظّم سیاسی نظام تھا۔ اور تمام اہل ہند اس کی تابع داری کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ ان بادشاہوں کی ایک اچھی عادت یہ تھی کہ وہ علم پروری کے بھی دلدادہ تھے۔ اہل علم کی قدر و وقعت کرتے تھے۔ نیز اہل علم کو جدید تحقیق کی راہ بھی ہموار کرتے تھے۔ البتہ مسعودی نے اس بات کو قطعی نظر انداز کر ڈالا ہے کہ ان بادشاہوں کا اپنی رعایا کے ساتھ رویہ کیسا تھا؟

ہندوستان کے قدیم حکماء کا فلسفہ

مسعودی نے لکھا ہے:

''ہندوستان کے پہلے بادشاہ کی نسل کے لوگ براہمہ کہلاتے ہیں۔ ان کے سات پسندیدہ دانشور گزرے ہیں۔ جن کا قول ہے کہ ہمارا وجود خالق کی حکمت پر مبنی ہے۔ لہٰذا ہمارا عدم اس کی حکمت کے زوال یا نقص کا باعث ہوگا۔ ان میں سے ایک دانشور کہتا ہے کہ ایسا کون ہے جو وجود عالم اور حقائق اشیاء کا کلی طور پر ادراک کر سکے۔؟ دوسرا کہتا ہے کہ عقل و حکمت کسی ایک شخص تک محدود نہیں ہوسکتی۔ تیسرا کہتا ہے کہ ہمارے لیے انہی اشیاء کا ادراک کافی ہے جو ہمارے اجسام و اذہان سے قریب تر ہیں۔ چوتھا کہتا ہے کہ اشیاء کی معرفت ہمارے لیے اسی حد تک ضروری ہے جہاں تک ہمیں ان کی احتیاج ہو۔ پانچواں کہتا کہ ہمیں ان حکماء کی صحبت اختیار کرنی چاہیے جو حقیقت اشیاء کے ادراک پر قادر ہیں۔ چھٹا کہتا ہے کہ اس دنیا میں ہمارا وجود حصول سعادت نفس کے لیے وقف ہونا چاہیے کیونکہ یہاں سے ایک دن جانا ضروری ہے۔ ساتواں کا کہنا ہے کہ ہم نہ اپنی خوشی سے آئے ہیں نہ یہاں سے جانے پر ہمیں اختیار ہے۔ رہی زندگی تو اس میں پریشانیوں اور تکالیف کے سوا رکھا کیا ہے۔[۵]

خصائل ورسوم

مسعودی نے لکھا ہے:

''ہندوستان میں شراب کی ممانعت ہے اور پینے والے کو سزا دی جاتی ہے لیکن یہ مذہبی نقطہ نظر سے نہیں کیا جاتا بلکہ ان کے نزدیک شراب پی کر نشے کی حالت میں انسان عقل وخرد سے عاری ہوجاتا ہے۔ اور اسے ملکی قوانین اور روایات کا پاس ولحاظ نہیں رہتا۔ البتہ حکمران کے لیے ضرورتاً سیاسی سوجھ بوجھ اور تدابیر ملکی پر غور وخوض کے لیے اس کا تھوڑا بہت استعمال صحیح سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستان میں گانے بجانے کا رواج بہت ہے جس کے لیے انھوں نے بہت سے آلات بنا رکھے ہیں۔ گانا بجانا خوشی اور غمی دونوں میں ہوتا ہے نیز پڑوسیوں کے یہاں تقریبات کے موقعوں پر گانا بجانا ضروری ہوتا ہے''[۶]

مسعودی نے ایک رسم کے متعلق اور لکھا ہے:

''میں نے ارض ہند کے خطۂ سراندیپ میں دیکھا اور وہ ایک سمندری جزیرہ ہے۔ کہ جب وہاں حکمراں فوت ہوجاتا تو اسے ایک خاص مقام پر لے جاتے ہیں جو اسی کام کے لیے مقرر ہے اور اس کی لاش وہاں رکھ دیتے ہیں۔ اس کی بیوی کے ہاتھ میں ایک پوٹلی ہوتی ہے جس میں سے مٹی نکال نکال کر وہ اپنے مردہ خاوند کے سر پر ڈالتی جاتی ہے اور کہتی جاتی ہے۔ 'اے لوگو! دیکھو یہ آج تک تمہارا حاکم تھا' اس کا ہر حکم تمہارے لیے واجب العمل تھا، اب اس نے دنیا چھوڑ دی، اس لیے اس کے احکام بھی آج سے ختم ہوگئے کیونکہ ملک الموت نے اس کی روح قبض کرلی ہے۔ اگرچہ وہ زندہ ہوکر دوبارہ نہیں مرے گا لیکن اس کے مرنے سے تم نہ بدل جانا' اس قسم کے الفاظ وہ لوگوں سے نیک چلنی پر پابند رہنے کے لیے کہتی ہے۔ اس کے بعد

تمام مذہبی رسوم ادا کر کے اس کی لاش کو آگ لگا دی جاتی ہے''۔ ؎

یہ رسوم ورواج آج بھی زندہ ہیں۔ بہر حال یہ ان کے رسم ورواج ہیں جن پر ہم کو کوئی تعرض نہیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ وطن عزیز تہذیبوں، ادیان اور ثقافتوں کا سنگم ہے۔ یہی ہمارے ملک کی اصل شناخت اور امتیاز ہے۔ اور یہی ہماری جمہوری اور آئینی قدروں کو یقینی بناتی ہیں۔

مسعودی کے افکار کی افادیت

آخر میں یہ عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موازنۂ ادیان اور تہذیبی دریافت کے حوالے سے مسلم مفکرین وعلماء نے ہر دور اور ہر زمانے میں گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ مذکورہ مباحث کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ دوسرے ادیان اور ان کی تہذیبوں کا مطالعہ مسلمانوں نے نہایت اعتدال اور غیر جانبدار ہو کر کیا ہے۔ آج ہمارے درمیان جو لوگ افتراق وخلیج پیدا کرنا چاہتے ہیں، ان کو یہ بتانا کافی ہوگا کہ مسلمانوں نے غیر مسلم اقوام کے ادیان وتہذیب اور ان کے سیاسی وسماجی نظام سے پوری طرح واقفیت حاصل کی۔ وہیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مسالک وادیان کی خوشگوار روایت کو ایک درست سمت دینے میں مسلم علماء کی خدمات کو سراہنا اور انہیں بروئے کار لانا نہایت ضروری ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اب نفرت اور تشدد کی آندھی چل رہی ہے۔ لوگ باہم ادیان وتہذیب کے مابین غلط فہمیاں پھیلا رہے ہیں۔ ان کا سد باب اسی وقت ہوسکتا ہے جب ہم مکالمہ جیسی خوشگوار روایت کو فروغ دیں۔ سماجی طور پر نکتہ اتحاد پر عمل کریں۔

کرشن بیتی

مصور فطرت خواجہ حسن نظامی (۱۸۷۸ء-۱۹۵۵ء) اردو زبان وادب کی ایک معتبر ومعروف شخصیت ہے۔ انھوں نے اردو ادب کے اہم اور بنیادی گوشوں کو اپنی تحریروں میں اجاگر کیا ہے۔ آپ نے تقریباً چھوٹی بڑی دو سو کتابیں اردو ادب میں تحریر کی ہیں۔ آپ ایک ادیب، مؤرخ شاعر، صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ تصوف وروحانیت سے بھی گہرا تعلق رکھتے تھے۔ یہی وجہ کہ ہزاروں کی تعداد میں لوگ آپ سے بیعت تھے۔ آپ کا ایک اور امتیاز یہ ہے کہ آپ نے اردو ادب میں پہلی مرتبہ سوانح حیات

اور آپ بیتی کا تصور پیش کیا اور اس موضوع پر باقاعدہ لگ بھگ ۱۸۹۰ء میں ایک کتاب تصنیف کی جو ۱۹۱۹ء میں شائع ہوئی۔ سطور ذیل میں آپ کی معروف کتاب 'کرشن بیتی' جس کا نام بدل کر بعد میں 'کرشن جیون' رکھا گیا ہے، کی اہمیت وافادیت کو پیش کیا جائے گا۔ آپ کی یہ کتاب اردو زبان میں تقابل ادیان کے موضوع پر ہے۔ اس کتاب میں ہندومت کی معروف شخصیت کرشن جی کی سوانح حیات کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کو مشائخ بکڈپو دہلی نے صفر/۱۳۴۲ ہجری-ستمبر ۱۹۲۳ء میں تیسری بار شائع کیا ہے۔ یہ کتاب اردو زبان وادب میں تقابل ادیان پر لکھی گئی کتب میں انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔

اس کتاب پر ایک دیباچہ مہاراجہ سرکشن پرشاد چشتی سابق وزیراعظم حیدر آباد دکن کا ہے۔ دوسرا دیباچہ معروف مصنف فلسفہ جذبات وفلسفہ اجتماع مولانا عبدالماجد صاحب کا ہے۔ یہ دونوں دیباچے کتاب کی عظمت ووقعت اور خواجہ حسن نظامی کی رواداری، ہندو مسلم اتحاد و یگانگت اور ان کی مطالعۂ ادیان پر گرفت ودسترس پر بین ثبوت ہیں۔

کرشن بیتی پر مفکرین کی آراء

مہاراجہ سرکشن پرشاد لکھتے ہیں:

''خواجہ صاحب مسلمان ہیں۔ موحد ہیں۔ صوفی ہیں۔ انھوں نے باوجود مسلمان ہونے کے ہندو مذہب کے ایک ہادی کی بزرگی وعظمت کو جس وقعت کے ساتھ ملحوظ رکھ کر اپنی بے تعصبی کا ثبوت دیا ہے، اگر چہ تعصب پرستوں کے دلوں میں خار سا کھٹکتا ہوگا، مگر خدا لگتی بات اور راستی اور ایمان کی تو یہی ہے کہ یہی انصاف ہے اور یہی انصاف دین ہے اور یہی دین وایمان ہے، جو سرمایۂ ناز ہے اور اسلام کی تعلیم بھی یہی ہے۔ یہ کتاب گو مسلمانوں کے لیے لکھی گئی ہے لیکن اس سے ہر مذہب اور عقیدہ کا آدمی فائدہ حاصل کرسکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اردو زبان میں اس طرز اور اس شان کی محققانہ وبے تعصّبانہ کرشن کے حالات میں اور کوئی کتاب نہ ہوگی۔ کرشن مہاراج کے ہر حصۂ زندگی کو اس عمدگی سے لکھا گیا ہے کہ واقعات کو

سمجھنے میں معمولی علم اور سمجھ کے لوگوں کو بھی دشواری نہ ہوگی۔ اور پھر کمال یہ کیا کہ انشا پردازی کی بہار ہر جگہ عجب مستانہ انداز سے دکھائی دیتی ہے۔ اور ہر قصہ کو عالم تصور بنا دیا ہے۔[۸]

آگے لکھتے ہیں:

''میں نے کرشن بیتی کو غور سے پڑھنے کے بعد یہ رائے قائم کی کہ یہ کتاب مدارس کے نصاب تعلیم میں شریک کرنی چاہیے۔ جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی اقوام ہندو مسلم میں اصلی اور سچا اتحاد پیدا ہو، ان کو اس قسم کی کتابیں اپنے بچوں کو پڑھانی چاہئیں، جن سے ہر قوم دوسری قوم کے رہنمایانہ مذہب کی عزت کرنے پر مائل ہوگی۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی رقم طراز ہیں کہ ہندوستان کی دیسی ریاستوں میں ایسی کتاب کا عام طور سے رائج کرنا ہندو مسلمان کے اس اتحاد کو اور زیادہ قوی کر سکتا ہے جو ریاستوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ اور جس کو بعض مفسدہ پرداز طبائع برباد کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔''[۹]

مذکورہ اقتباس کے تناظر میں یہ میں یہ پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ مہاراجہ سر کشن پرشاد نے خواجہ حسن نظامی کی اس شاہ کار تصنیف کی انفرادیت کا کھل کر اعتراف کیا ہے۔ انھوں نے اپنے دستاویزی دیباچہ میں ہندو مسلم اتحاد کی طرف ایک اہم قدم بتا کر امید ظاہر کی ہے کہ یہ کتاب دونوں قوموں کے مابین پرخاش اور کشمکش کو رفع کرنے میں اہم کردار ادا کرے گی۔

مولانا عبدالماجد صاحب نے اس کتاب کے متعلق انتہائی اہم دیباچہ تحریر کیا ہے:

''ہندوستان کا مخصوص دائرۂ عمل تصوف و روحانیت رہا ہے۔ یہاں اس فن کو جس حد کمال کو پہنچایا گیا ہے، اس کی نظیر شاید دنیا کے کسی بھی حصہ میں نہ ملے گی، گوتم بدھ کی تعلیمات تو تمام تر تصوف نہیں خود ہندو مذہب میں طریقت کا عنصر شریعت پر غالب ہے۔ یہاں کے پیشوایان طریقت کا شمار غالباً کل دنیا کے رہبران شریعت سے کم نہیں۔ آگے لکھتے ہیں کہ اردو کا یہ

افلاس تاسف انگیز ہے کہ اس میں اس موضوع پر برائے نام سے زیادہ مواد موجود نہیں۔خواجہ صاحب مستحق تہنیت ہیں کہ انھوں نے اس میدان میں پیش قدمی کی اور سری کرشن کے حالات زندگی پر ایک دلچسپ تالیف تیار کردی جو اگر چہ مختصر ہے تاہم اردو کی موجودہ سطح کو دیکھتے ہوئے بہت غنیمت ہے۔''[۱۰]

اس کے بعد مولانا عبدالماجد دریابادی جو لکھتے ہیں وہ انتہائی اہم اور عصری تقاضوں کی بنیاد ہے:

''سری کرشن ارباب طریقت کے ایک مسلم ومحترم پیشوا ہوئے ہیں۔خواجہ صاحب بھی اسی طائفہ عالیہ کے نام لیوا ہیں۔ایک بڑی بارگاہ کے خاص متوسل ہیں اور ایک جماعت کثیر کے مرشد ورہنما ہیں۔ان سے زیادہ اس کام کی اہلیت کسی میں نہیں ہے۔''[۱۱]

کرشن بیتی کی تصنیف کی وجوہات

اس گتھی کو خود صاحب کتاب خواجہ حسن نظامی نے واضح کیا ہے کہ اس کتاب کے لکھنے کی اصل وجہ کیا تھی۔ذیل کی سطور میں ہم اس حقیقت کو کسی حد تک پیش کرنے کی سعی کریں گے:

''میری خواہش اس کتاب کی تصنیف سے یہی ہے کہ مسلمانوں کو سری کرشن جی کے اصلی حالات بتاؤں،اور ان کے پاکیزہ دماغوں کو برگزیدہ آدمی کی نسبت بدگمان نہ رہنے دوں، جو قرآن شریف کی ہدایت کے خلاف ہے،جس میں ارشاد ہے ان **بعض الظن اثم** میرا خیال وعقیدہ ہے کہ سری کرشن کو بے اعتبار کتابوں کے عقائد کی بناء پر عیاش،فریبی،فتنہ پرداز سمجھنا حقیقت کے خلاف اور سخت گناہ ہے۔میں اس ارادہ میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں؟ یہ جب معلوم ہوگا کہ کہ پڑھنے والے قومی تعصب سے الگ ہوں،اور انسانیت و سچے اسلام کی تعلیم انصاف سے متاثر ہو کر اس کو

پڑھیں۔اور اچھا نتیجہ نکالنے کا ارادہ رکھیں۔''[۱۲]

اس کے علاوہ ایک دوسری وجہ اس کتاب کے لکھنے کی یہ ہے کہ اس کے ذریعہ اردو زبان کی خدمت بھی ادا ہوگی۔

''کیونکہ ہم سب ہندو مسلمان اپنی اس زبان کی ترقی کے فرض میں شریک ہیں جو ہم دونوں کو زندہ رکھنے اور آگے بڑھانے کی کنجی ہے۔ضد اور ہٹ دھرمی نے ہم دونوں کو اندھا کر رکھا ہے۔ورنہ سچ بات یہ ہے کہ (اردو اگر وہ اردو ہو) ہندو مسلمانوں کی مشترکہ، سارے ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے۔، ہر ہندوستانی کا دل اس کو تسلیم کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ ہماری زبان ویسی ہی شاندار ہو جائے ،جیسا ہمارا ملک تمام دنیا میں شاندار ہے۔اردو ہندی کی بحث میں دونوں فریق اصولی مقصد کو بھول جاتے ہیں اور ایک بھائی دوسرے ملکی بھائی کو حریفانہ نظروں سے دیکھتا ہے۔اردو زبان میں سری کرشن کے حالات بہت کم ہیں،اور جو ہیں وہ ذاتی عقائد وخیالات کی بناء پر لکھے گئے ہیں۔مثلا لالہ راجپت رائے صاحب نے جو لائف آف سری کرشن جی لکھی ہے اس میں آریہ سماجی نظریات سے ہر بات کو درج کیا ہے۔ گویا قدیمی خیال کے ہندوؤں کی تردید میں یا سماجی اصلاح کے ماتحت یہ کتاب مرتب ہوئی ہے۔اگرچہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ وہ بہت غنیمت ہے۔''[۱۳]

یہ وجہ تصنیف خواجہ حسن نظامی نے کتاب کے دیباچہ میں رقم کی ہے۔اس کا جو مقصد ومنشا ہے وہ یہ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں سری کرشن کے حوالہ سے جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں ان کو دور کیا جائے اور دونوں قوموں کے باہم رشتے خوشگوار رہیں۔یہ سچائی ہے کہ جب معاشرے میں ایک دوسرے کے مذہب اور برگزیدہ شخصیات کا احترام وتقدس یقینی ہوگا تبھی سماج کو صالح اور صحت مند کہا جاسکتا ہے۔اب ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے دیگر ضروری مباحث کو اختصار سے قلم بند کیا جائے۔اس کتاب کے اندر سری کرشن کے احوال وکوائف کو انتہائی سنجیدگی اور محققانہ اسلوب کے تحت پیش کیا گیا ہے۔اس

سلسلے میں بس اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اگر کوئی بھی اس کتاب کا مطالعہ کر لے تو اسے نہ صرف سری کرشن جی کی شخصیت، افکار ونظریات کے متعلق تمام چیزوں کا علم ہو جائے گا بلکہ اس کو ہندوازم کی بھی بہت ساری معلومات حاصل ہوسکیں گی۔

ہندو مذہب کی تاریخی حیثیت

یہ بات بالائی سطروں میں آچکی ہے کہ اس کتاب کا دیباچہ مہاراجہ سرکشن پرشاد نے لکھا ہے۔ کتاب کا یہ دیباچہ انتہائی عالمانہ اور ہندوازم کی مفید و بنیادی معلومات پر مبنی ہے۔ چنانچہ مہاراجہ سرکشن پرشاد لکھتے ہیں:

> ''قوموں کے تاریخی حالات سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ ہندوؤں کا مذہب سب سے قدیم ہے۔ جس زمانہ میں مصر اور یونان اور روم کے مذاہب کی بناء بھی نہ پڑی تھی اور اہل دنیا کے کان ان سے آشنا بھی نہ ہوئے تھے، اس مذہب کی عمارت کب کی تیار ہو چکی تھی۔ یہی نہیں بلکہ ہندو مذہب قدیم زمانہ کے مذہبوں سے نہایت شاندار اور عجیب وغریب ظاہر ہوا، یہ کوئی ایک مذہب نہیں ہے، نہ اس کی عمارت کی طرز تعمیر ایک وضع پر ہے۔ اس مذہب کو مشرقی طرز کے نہایت خوش نما عظیم الشان اور وسیع محل سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جو دور سے ایک حیرت انگیز عمارت نظر آتی ہے اور قریب جا کر بغور دیکھنے سے منزل پر منزل چنی ہوئی معلوم ہوتی ہے''[۱۴]

مذکورہ اقتباس اس بات پر شاہد عدل ہے کہ ہندو مذہب انتہائی قدیم ہے لیکن اس کا فلسفہ متعدد نظریات اور مختلف افکار کا مرقع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود علماء ہنود اس کی کوئی بھی جامع اور مانع تعریف وتوصیف بیان کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔

توحید کے سلسلہ میں مہاراجہ سرکشن پرشاد نے لکھا ہے:

> ''ہندو مذہب بہت بڑا ذخیرہ ہے مذہبی خیالات کا، اس میں نہ باطل عقائد کا نشان ہے، نہ کفر و بت پرستی کا، بلکہ یہ ایسا مذہب ہے کہ اگر اس کے

نکات اور عظمت دریافت کرنے کے لیے مقدس رشیوں اور باخدا دیوتاؤں کے طریق علم وعمل کو دیکھا جائے تو خداپرستی کی پوری شان اور توحید کی حقیقی تصویر نظر آئے گی۔ ہندو مذہب کا اصل الاصول بالکل اس کے مصداق ہے **من عرف نفسه فقد عرف ربه.**''[۱۵]

نتیجہ کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ہندو مذہب کے اندر توحید کا تصور پایا جاتا ہے، اگرچہ موجودہ زمانہ میں اس کی اصل شکل کو بگاڑ دیا گیا ہے۔ ہندو دھرم میں بت پرستی کا انکار کرنے والے خود ہندو مذہب کی تمام مقدس کتابیں بھی ہیں۔ ہندو مذہب کے متون مقدسہ رگ وید، اتھر وید، یجر وید، اور سام وید، کے علاوہ دیگر اہم ہندو مذہب کے بنیادی دستاویز میں بھی توحید کا تصور پیش کیا گیا ہے۔

آریہ قوم کی ہندوستان آمد

مہاراجہ سرکشن پرشاد نے لکھا ہے کہ ہندو مذہب کی تاریخ کو سات ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے اور یہی ساتوں ادوار اس مذہب کی نشو ونما کے بھی ہیں۔ پہلے دور کے متعلق بتایا ہے کہ اس زمانہ کی تاریخ رگ وید سے معلوم ہوتی ہے۔ عیسی علیہ السلام سے تقریباً دو ہزار سال پیش تر ایک قوم ہند میں آئی، جنکی جلد سفید اور بال سیاہ تھے۔ یہ قوم ایک ہی زبان بولتی تھی جس کا نام آریک تھا۔ یہ اصل زبان تو مفقود ہوگئی ہے لیکن سنسکرت اسی سے مشتق ہے۔ یہ قوم کابل کے دروں سے ہوکر ہندوستان میں آئی اور اطراف واکناف میں پھیلی۔ یہ خانہ بدوش تھی، اسے فن زراعت کا علم تھا اور اکثر اقوام کی ابتدائی حالت کی طرح ان کا مخیلہ نہایت ہی زوردار تھا۔ دوسرے دور میں یہ قوم آگے بڑھی اور ستلج تک پہنچ گئی اور پھر وہاں سے گنگا جمنا تک بڑھی، اسی دور میں ہندو مذہب کے فلسفہ کی تصنیف بھی ہوئی۔ گویا اس طرح آریہ قوم آگے بڑھتی گئی اور ہندو مذہب کی ترویج واشاعت بھی ہوتی چلی گئی۔[۱۶]

مذکورہ بالا تمام حقائق وشواہد کی رو سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ خواجہ حسن نظامی کی اردو زبان وادب میں لکھی گئی تقابل ادیان پر کتاب 'کرشن جیون' یا 'کرشن بیتی' کئی اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے۔ ایک تو یہ کہ اس کتاب کے اندر مصنف موصوف نے انتہائی رواداری اور انصاف کے ساتھ سری کرشن جی کے حالات کو تقریبا بیس سال کے طویل عرصہ میں مرتب ومدون کیا ہے۔

دوسری بات یہ کہ اس کتاب کے توسل سے ہندو دھرم کی متبرک شخصیت سری کرشن کے متعلق عوام وخواص میں جو بے بنیاد باتیں پھیل رہی تھیں ان پر روک لگے گی۔ تیسری اور آخری بات یہ کہ اس طرح کی کاوش وسعی سے ہندوستان کی جمہوری اور آئینی قدریں بحال ہوں گی نیز دونوں قوموں ہندو اور مسلم کے مابین باہم اعتبار وارتباط اور تحمل وبرداشت کی راہ ہموار ہوگی جو یقیناً ہماری نسلوں کو مذہبی منافرت کے خاتمہ کی طرف تیزی سے لے جائے گی اور تکثیری سماج کی شناخت بھی یہی ہے کہ اس میں ایک دوسرے کے مذاہب کا مطالعہ کیا جائے، ان کی خوبیوں اور خامیوں پر نگاہ رکھتے ہوئے مذاہب کے تقدس واحترام کا درس عام کریں تاکہ روئے زمین پر امن وامان اور صلح وآشتی کی فضا روشن ہوجائے۔

ہندو مذہب کی معلومات

گزشتہ مضمون میں یہ بات ذکر کی جا چکی ہے خواجہ حسن نظامی نے ہندو مذہب کی برگزیدہ شخصیت سری کرشن پر انتہائی چشم کشا اور مفید معلومات پر مشتمل ایک طویل تصنیف بیس سال کے طویل عرصے میں مرتب کی ہے۔ انہی کی ایک اور تصنیف 'ہندو مذہب کی معلومات' کے نام سے ملتی ہے۔ یہ کتاب چالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے ساتھ نواب سرامین جنگ بہادر کا فلسفہ 'ملل ہنود' بھی شامل اشاعت ہے۔ ان دونوں رسالوں/کتابوں کو حلقہ مشائخ بک ڈپو دلی پرنٹنگ ورکس دہلی نے ۱۹۲۳ء میں شائع کیا ہے۔ سطور ذیل میں راقم خواجہ حسن نظامی کی کتاب 'ہندو مذہب کی معلومات' پر چند گذارشات پیش خدمت ہیں۔

خواجہ حسن نظامی نے زیر تذکرہ کتاب اول ہندو مسلم یکجہتی اور باہم میل ومحبت کے فروغ کے واسطے مرتب کی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد اردو دان طبقہ کو ہندومت سے خاصی واقفیت اور جان کاری حاصل ہوجائے گی۔ کیونکہ ہندوستان جیسے تکثیری معاشرہ میں خواجہ حسن نظامی کی اس کتاب کی اہمیت وافادیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ اس کتاب کی اشاعت اور اس کے مطالعہ سے یقیناً ہندوستان کی دونوں اقوام کے مابین جو خلیج وفاصلہ، کچھ مفاد پرست اور موقع پرست افراد نے قائم کر رکھا ہے وہ ضرور دور ہوگا اور لامحالا اس کا خاتمہ ہوگا۔ صاحب کتاب کا مقصد بھی یہی ہے کہ تکثیری سماج کی جو صالح اور روشن اقدار ہیں ان کو بہتر خطوط پر استوار کیا جائے تاکہ نوجوان نسل کے اندر باہم

ہمدردی، رواداری، پیار، محبت، سلامتی اور بقائے باہم جیسی پاکیزہ اور شفاف خصال و عادات رچ بس سکیں۔ ہندوستان جیسے تکثیری سماج میں بقائے باہم کی درخشاں روایت اسی وقت مستحکم و مضبوط ہوسکتی ہے جب ہم تعصب ونفرت کی عینک اتار کر دوسرے مذہب کا مطالعہ کریں اور اگر کوئی تنقید کا موقع بھی پائیں تو وہ تنقید برائے اصلاح ہو نہ کہ تنقید برائے تنقیص۔ ہندو قوم سے ہمدردی اور یکجہتی کا اظہار انھوں نے جس مخلصانہ انداز میں کیا ہے اس کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

خواجہ حسن نظامی لکھتے ہیں:

''ہندوؤں جیسی عظیم الشان اور قدیمی قوم کی نسبت اور اس کے عجیب مذہب کے بارے میں اس رسالہ کی مختصر باتیں اس قابل ہرگز نہیں ہیں کہ ان کو ہندو مذہب کی معلومات کہا جاسکے۔ تاہم چونکہ مسلمانوں میں اس قسم کے مضامین رائج نہیں ہیں اس واسطے ان کو یہ سب باتیں نئی معلوم ہوں گی اور ان کی معلومات کو تھوڑا بہت فائدہ اس رسالہ سے پہنچے گا۔ اب تک ہندوؤں کے مذہب کی نسبت صرف اعتراض کرنے والے مسلمانوں نے کچھ رسائل لکھے تھے اور ہندو مذہب کی صرف وہی باتیں قلم بند کی تھیں جن پر اعتراض ہوسکے، مگر میں نے یہ رسالہ صرف مسلمانوں کی معلومات کے لیے لکھا ہے۔ جھگڑا، اعتراض اور مناظرہ اس سے مقصود نہیں ہے۔''[۷۱]

درج بالا اقتباس کی روشنی میں یہ بڑے وثوق و اعتماد سے کہا جاسکتا ہے کہ خواجہ حسن نظامی ہندو مسلم اتحاد کے سچے علمبردار اور اس کے بڑے پیمانے پر مبلغ و داعی تھے۔ انھوں نے ہندو مذہب کی معلومات کے لکھنے کا بنیادی اور اہم فلسفہ بھی یہی بتایا ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد دونوں قوموں میں ضرور تحمل و برداشت کی روایت فروغ پائے گی۔ اور جو افراد و اشخاص مسلم کمیونٹی میں ایک دوسرے کے مذہب کو لعن طعن کرتے ہیں دراصل اس کی بنیادی وجہ اس مذہب سے ہمارا لاعلم ہونا ہے۔ جب ہم کسی بھی مذہب کی مکمل معلومات حاصل کر لیتے ہیں اور اس کے نشیب و فراز سے واقف ہوجاتے ہیں تو جو نفرت اس مذہب کے خلاف پنپ رہی ہوتی ہے اس کا یکسر خاتمہ ہوجاتا ہے۔

اسی وجہ سے اس کتاب کے اندر خواجہ حسن نظامی نے ہندو مذہب کے متعلق تمام بنیادی اور

اہم باتوں کو نہایت اختصار اور جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ تا کہ کم وقت میں ایک اردو خواندہ شخص بھی ہندو مذہب کی عام چیزوں سے واقف ہو سکے۔

ہندومت کی اصطلاحات

یہ سچ ہے کہ کسی بھی تہذیب اور مذہب سے واقفیت اور آشنائی حاصل کرنے کے لیے اس مذہب یا تہذیب کا کلچر وثقافت، اس کی اصطلاحات کو جاننا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ تا کہ اس مذہب کی تہہ تک قاری یا محقق ومصنف با آسانی پہنچ سکے۔ ہر مذہب میں کچھ اصطلاحات ہوتی ہیں۔ اسی طرح ہندو مذہب میں بھی بہت سارے خاص الفاظ ہیں۔ ان کا مفہوم ومعنی اسی وقت صحیح طور پر سمجھ میں آپائے گا جب ہم ان الفاظ واصطلاحات کو ہندو مذہب سے جوڑ کر سمجھنے کی سعی کریں گے۔ خواجہ حسن نظامی نے تقریباً ہندوازم کی ۷۶ اصطلاحات کا تعارف کرایا ہے سطور ذیل میں ان میں سے چند الفاظ کا تعارف نذر قارئین ہے۔

''اوم''۔ اسم ذات۔ باعث اور بنیاد ومنبع ظہور تمام موجودات۔ ازل وابد کا محیط۔ ''برہم'' اسم ذات بمعنی اللہ۔ دھرم- مذہب، دین، ایمان، عقیدہ۔ مت- مذہبی فرقہ۔ خاص عقائد کا گروہ۔ ودیا۔ علم، علم دین، معلومات ظاہری، ایشور بھگتی- خدا کی محبت، خدا کی اطاعت، عشق الٰہی، رضائے الٰہی۔ برہما جی- صفت خلق، ذریعہ پیدائش عالم خالق۔ پرم آتما- ذات مطلق، ذات بحث یعنی روح کل۔ مہادیو- دیوتاؤں میں سب سے بزرگ جس کے سہارے زمین وآسمان اور ہر سہ عالم ہنود قائم ہے۔ ان کی سواری بیل ہے۔ ان کے مندر میں پنڈی (عضو مخصوص) اور ایک بیل کی مورتی ہوتی ہے۔ پاروتی۔ مہادیو جی کی بیوی کا نام ہے۔ ویراگ - عالم سے بے تعلقی اور نفرت، ترک ماسوا، رہبانیت - مہاتما۔ عارف بزرگ، جوگ- ملنا، وصل ہونا، علم تصوف درویشی۔ اندر- یعنی حواس کا قادر اور مالک۔ کمنڈل- کشکول گدائی۔ مزید تفصیل کے لیے مذکورہ کتاب سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔[۱۸]

جوگیوں کے عقائد

خواجہ حسن نظامی نے اس سلسلے میں انتہائی اہم اور وقیع معلومات پیش کی ہیں۔ جوگیوں کو

ہندو مذہب کا صوفی کہنا زیادہ مناسب ہے۔ان کے افکار وعقائد بھی بڑے عجیب وغریب ہیں۔ چنانچہ ان کے عقائد کا ذکر کرتے ہوئے خواجہ حسن نظامی نے لکھا ہے:

''کوئی ایک سب سے برتر خدا، ایشور ہے، جو پاک ہے۔اور وہ ایک ایسی روح ہے، جو تمام دنیا پر محیط ہے،اور تمام تکلیفوں اور خواہشوں سے آزاد ہے، اس کا نشان لفظ اوم ہے، وہ پیدا کرنے والا اور حفاظت کرنے والا ہے، وہ اس دنیا کا نہیں ہے اور نہ اس کا ان سے کوئی تعلق ہے۔''[۱۹]

اسی طرح ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ

''دنیا میں بے شمار روحیں ہیں جن سے سب جاندار موجود ہیں۔اور وہ سب ازلی ہیں۔وہ روحیں پاک ہیں ان میں تغیر وتبدل نہیں ہے، لیکن وہ دنیا میں رہنے سے رنج وراحت سے آشنا ہیں اور چوراسی لاکھ قسم کی قالب میں جنم لیتی پھرتی ہیں۔''[۲۰]

یہ بھی ملاحظہ فرمائیں:

دنیا کسی کی پیدا کی ہوئی نہیں ہے، بلکہ ازلی ہے۔دنیا کے ظہور بدلتے رہتے ہیں لیکن وہ قوت جس سے ظہور بدلتے رہتے ہیں یکساں رہتی ہے۔اس سے مماثل ۱۶ عقائد کا تعارف صاحب کتاب نے انتہائی دیانت واعتدال سے کیا ہے۔

ہندوؤں کی مقدس اشیاء

ہندوؤں میں چار چیزیں بہت مقدس و پاکیزہ مانی جاتی ہیں۔انہیں عموماً ہندوؤں کے چار'' گاف'' سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔یعنی گائے، گنگا، گیتا، اور گائتری منتر۔گائے کی تعظیم اور احترام ان کے یہاں بہت زیادہ ہے۔اور گائے کا احترام ہندو مذہب کا ہر گروہ وفرقہ کرتا ہے۔لیکن خواجہ حسن نظامی کی تحقیق کے مطابق کوئی بھی ہندو ایسا نظریہ نہیں پیش کرسکتا ہے جو منطقی ہو۔انھوں نے اس سلسلے میں اپنی رائے پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہزاروں برس سے ہندو قوم اس کی پوجا وعبادت کرتی آئی ہے۔لہٰذا یہ ان کے دل ودماغ میں پیوست ہو چکا ہے۔اور بچہ بچہ کا سینہ گائے کی محبت وعقیدت سے معمور ہے۔اس کے

بعدانھوں نے انتہائی اہم پیغام دیا ہے کہ غیر ہندو اقوام کو گائے کے سلسلہ میں صرف ہندوؤں پر خاش نہیں کرنی چاہیے۔خواجہ حسن نظامی نے مزید لکھا ہے کہ گائے کے علاوہ ہندو قوم میں کوئی اور ایسی چیز نہیں جو تمام ہندو فرقوں کے جذبات میں یکساں جوش و یگانگت پیدا کر سکے۔[۲۱]

دوسرا مقام ہندوؤں کے یہاں گنگا کو حاصل، ہے یہ ایک دریا ہے جسے تقریباً تمام ہندو فرقے مقدس تسلیم کرتے ہیں۔اور اس میں غسل کرنا اپنی نجات کا باعث مانتے ہیں۔لیکن ہندوؤں کے تین فرقوں کو گنگا میں نہانے کی اجازت نہیں ہے۔اس واسطے وہ گنگا کی عزت و توقیر تو کرتے ہیں،مگر گنگا سے خاص وابستگی نہیں رکھتے ہیں۔گنگا کی عظمت و توقیر کی بھی کوئی ہندو نہ عقلی اور نقلی منطق پیش کر پاتا ہے۔ اقتصادی یا زراعتی حوالے سے اس کی عظمت کو ثابت کرنے کی سعی ہوتی ہے جو یقیناً ناکافی ہے۔کیونکہ ہندوستان میں ایسی بہت سے ندیاں ہیں جن کے توسل سے کھیتوں میں آب پاشی ہوتی ہے اور زراعت کو خوب فائدہ ہوتا ہے۔[۲۲]

تیسرا گیتا کا مقام و مرتبہ بھی ہندوؤں کے یہاں کافی ہے۔گیتا سری کرشن جی کے خطبات کا مجموعہ ہے۔جس میں فلسفہ حیات اور فلسفہ کائنات کو نہایت عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔ ہندو دھرم سے تعلق رکھنے والا بڑا گروہ گیتا کو مانتا ہے اور اس کی عبادت کرتا ہے۔خواجہ حسن نظامی لکھتے ہیں:

> ''اگر چہ رامائن کی عظمت بھی لاکھوں کروڑوں ہندوؤں میں کی جاتی ہے، جس میں رام چندر جی کے حالات قلم بند ہیں۔مگر گیتا کے برابر اس کو مقبولیت حاصل نہیں ہے۔رامائن صرف خوش عقیدہ ہندوؤں میں محبوب ہے،اور گیتا اہل علم و دانش اور فلاسفر طبقہ میں مقبول ہے اور خوش عقیدہ ہندوؤں کے یہاں بھی مانی جاتی ہے۔تاہم بعض ہندو ایسے بھی ہیں جنہیں گیتا کی عظمت سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ بعض ہندو تو اس کو سری کرشن کی کتاب ہی نہیں مانتے ہیں۔''[۲۳]

چوتھا گائتری منتر۔خواجہ حسن نظامی نے دعویٰ کیا ہے کہ اس کو ہندوؤں کا کلمہ توحید سمجھنا چاہیے۔اس کی ہندوؤں میں بہت عزت کی جاتی ہے۔اس کو کوئی بھی ادنی ذات کا فرد نہیں پڑھ سکتا ہے۔اگر کسی بھی ادنی ذات کے شخص نے اس کی قرأت کر لی تو اس کے کانوں میں گرم کر کے سونا ٹھونسا

جائے گا۔ چنانچہ خواجہ حسن نظامی کی تحقیق کے مطابق یہ بات بھی ہے کہ اس منتر کی قرأت صرف برہمن ہی کرسکتا ہے۔ چھتری، ویش اور شودر نہیں کرسکتے لیکن بعض لوگوں کی تحقیق یہ ہے کہ اسے شودروں کے علاوہ ہندو مذہب کی دیگر ذاتیں پڑھ سکتی ہیں۔[۲۴]

خواجہ حسن نظامی نے اپنی اس تحقیق میں ہندو مذہب کی چار بڑی علامت ونشانی اوران کے متعلق ہندواقوام کے عقائد ونظریات کوتفصیل سے بیان کیا ہے۔انھوں نے اس باب میں ہندوؤں کے ان نشانات پراپنی رائے بھی دینے سے بہت حدتک گریز کیا ہے۔اگردی بھی ہےتواس طور پرکہ ان کے مذہب کی کسی مقدس شی کی بے حرمتی کا ارتکاب نہ ہو۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ہندوؤں کے اہم مذہبی ستون ہیں۔ان پرتنقید یارائے زنی کرنے سے ہندو بھائیوں کی دل آزاری اور دل شکنی ہوگی۔اوراس کی اجازت کسی بھی دھرم میں نہیں ملتی ہے۔خصوصااسلام توکسی بھی مذہب اوراس کی مقدس شخصیات کی بے حرمتی یاتوہین کرنے کی سخت الفاظ میں مذمت کرتا ہے۔

اس کے علاوہ خواجہ حسن نظامی نے اپنی 'ہندو مذہب کی معلومات' میں ہندوؤں کے مذہب کے متعلق دیگراہم باتیں بھی بیان کی ہیں مثلا۔ ہندوؤں کی دینی کتابیں، چاروں وید، ان میں اشلوکوں کی تعداد، پران ،ان کے مرتبین اوران کے موضوعات،اسی طرح اپنشدوں سے متعلق ضروری مباحث ومسائل کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔اسی طرح ہندو مذہب میں ذات پات کی تقسیم، برہمن ،چھتری، ویش اورشودر کے نظام پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

ضمناً یہ بتانا بھی نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ حسن نظامی نے اس کتاب کی ترتیب وتصنیف اورتالیف جہاں انھوں نے ہندوقوم کے درمیان میں رہ کرکی ہے وہیں اس کی ترتیب میں جن بنیادی ماخذ ومصادر سے مدد لی گئی ہے وہ بھی ہندوازم پرانتہائی اہم اورمعتبر دستاویزات تصور کی جاتی ہیں۔

خواجہ حسن نظامی رقم طراز ہیں:

> ''میں نے اس رسالہ کی تالیف میں اپنے لائق وفاضل دوست جناب امر ناتھ صاحب ساحر رئیس دہلی کی کتاب ''شرح وشنو پران'' سے مدد لی ہے۔ اسی طرح اوجاگرمل صاحب کی کتاب 'مخزن مذاہب' سے بھی استفادہ کیا

گیا ہے۔''[۲۵]

خواجہ حسن نظامی کی کتاب 'ہندو مذہب کی معلومات' کا مطالعہ کرنے سے علم و تحقیق کے جدید گوشے اور پہلو اجاگر ہوتے ہیں اور ہندو مذہب کی بہت ساری ان باتوں کے متعلق علم ہو جاتا ہے جن کو مسلم کمیونٹی میں ابھی تک کسی نے بھی واضح نہیں کیا تھا۔ اس اعتبار سے اس دور میں بھی اس کتاب کی عظمت اور اہمیت سے قطعی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ پیغام بھی جاتا ہے کہ برادران وطن کا ایک بڑا طبقہ یہ محسوس کرتا ہے کہ مسلم قوم، ہندو مذہب اور اس کی برگزیدہ شخصیات کو حقارت و ذلت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ لہٰذا اس تصنیف نے برداران وطن کے اس شک و خدشہ کو دور کرنے میں بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ یہاں ایک بات اور بتاتا چلوں، جس دور میں یہ کتاب مرتب ہوئی تھی اس وقت مادر وطن انگریزوں کے استبداد و تسلط میں تھا، لہٰذا انگریز چاہتے تھے کہ ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد مضبوط نہ ہو پائے۔ قیاس یہی ہے کہ وہ اس طرح کی کاوشوں سے بھی خوش نہ ہوتے ہوں گے۔ مگر اس وقت بھی اسی طرح کے ادب و لٹریچر کی اشاعت و ترویج نے ہندو مسلم کمیونٹی کی اجتماعیت کو روحانیت اور تازگی بخشی تھی اور ہندوستان آزاد ہوا۔ لہٰذا ایک بار پھر ملک میں مذہبی منافرت بڑھائی جا رہی ہے اور ہندو مسلم اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی ناکام سعی ہو رہی ہے۔ اس لیے ایک بار پھر ملک کے تمام مذاہب و ادیان کے حاملین کو یکجا ہونا ہوگا اور انہیں اس طرح کے ادب و لٹریچر کی تیزی سے ترویج و اشاعت کا فریضہ انجام دینا ہوگا تاکہ جو لوگ مذہب کے نام پر زراعت و کاشت کر رہے ہیں ان کی یہ نفرت آمیز کھیتی برگ و بار نہ لا سکے۔

تحفۃ الہند

دین اسلام ہی ایک ایسا نظام حیات ہے، جو زندگی کے تمام شعبوں میں مکمل رہنمائی کرتا ہے چاہے ان کا تعلق عقائد، عبادات، معاملات، اخلاقیات یا پھر سیاست و امامت سے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کا دائرہ کار ہر زمانہ میں بڑھتا رہا ہے۔ موجودہ حالات میں اگر ہم عالمی منظر نامے کا انصاف سے تجزیہ کریں، تو یہ حقیقت طشت از بام ہوتی ہے کہ جن خطوں اور ممالک میں اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کیا گیا، دین اسلام کو حسد اور عناد کی بناء پر بدنام کرنے کی ناکام سعی کی گئی، آج وہیں سب سے زیادہ لوگ داخل اسلام ہو رہے ہیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ جب بھی اسلام کے خلاف نفرت یا زہر افشانی کی گئی

ہے تو اس کے نتیجہ میں نہ جانے کتنے افراد کے اندر اسلام کا مطالعہ کرنے کا شوق و جذبہ جاگزیں ہونے لگتا ہے۔ پھر وہ اسلام کی خوبیوں اور اس کی پاکیزہ و روشن تعلیمات سے متاثر ہو کر دائرہ اسلام میں آ جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ آج سے شروع نہیں ہوا ہے۔ بلکہ صدر اسلام سے لے کر آج تک یہ تانتا لگا ہوا ہے۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ شاید ہی کوئی دقیقہ یا دن گزرتا ہوگا کہ نئے لوگ اسلام میں پناہ نہ لیتے ہوں۔ اسی پر بس نہیں ہے۔ کتنے نومسلم ایسے ہیں جنھوں نے قبول اسلام کے بعد بلا زور و جبر کے اسلام کی مدح سرائی میں کتابیں تحریر کی ہیں۔ اسی طرح کا ایک واقعہ پاپل بستی (یہ بستی راجہ پٹیالہ کے علاقے میں واقع ہے۔ اور یہ شہر لودھیانہ سے تھوڑی دوری پر مشرق کی جانب واقع ہے) میں پیش آیا وہاں کے ایک اننت رام نامی شخص دولت اسلام سے سرفراز ہوا۔ اسلام لانے کے بعد ان کا نام عبیداللہ (۱۳۱۰ھ) رکھا گیا۔ انھوں نے اسلام سے سرفراز ہونے کے بعد اسلام اور ہندو دھرم کے تقابل پر 'تحفۃ الہند' کے نام سے ایک کتاب تحریر کی۔ اس کتاب کے مقدمے میں مصنف نے اپنے اسلام لانے کے واقعہ کو بھی قلم بند کیا ہے۔ یہ کتاب تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں ایک تکملہ اور رسالہ کتھا سلوئی بھی ہم رشتۂ عریضہ ہے۔ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے جس کی تفصیل اس طرح ہے۔

مباحث کتاب

باب اول عقائد: اس کے تحت درج ذیل مباحث پر فاضل مصنف نے گفتگو کی ہے۔ عقیدۂ توحید، فرشتے، کتابیں، انبیاء، قیامت، معبود، اختلاف مذاہب، دعوت و تبلیغ۔ باب دوم کے مباحث کی تفصیل درج ذیل ہے۔ عبادات، نماز، روزہ، صدقہ، حج، ایصال ثواب۔ باب سوم معاملات پر مشتمل ہے، اس کے مباحث بھی قابل مطالعہ ہیں۔ نکاح، حلال و حرام، سلام کہنا، کاموں کا شروع، شرافت و رذالت، عدالت و انصاف۔ باب چہارم کے مباحث: ہندوؤں کے جوابات، خاتمہ، اسلام کی خوبیاں، تکملہ، کتھا سلوئی۔

یہاں یہ بات بتانا مناسب ہے کہ بالائی سطروں میں جو مباحث بیان کیے گئے ہیں ان میں اسلام اور ہندو دھرم کا تقابل پیش کیا گیا ہے۔ اطمینان بخش بات یہ ہے کہ صاحب کتاب نے ہندوؤں کی تعلیمات کو ان کے بنیادی مذہبی مآخذ اور مصادر و مراجع سے نقل کر کے کتاب کی اہمیت

کو بڑھایا ہے۔

تاریخ اشاعت

کتاب کی سن اشاعت کی بابت خود مصنف نے لکھا ہے۔اس کو پہلی بار ۱۲۶۸ھ میں لدھیانہ کے کتب خانہ نے شائع کیا۔پہلی اشاعت کے بارے میں مصنف نے لکھا ہے:

''اس میں بعضے الفاظ اور عبارات مشکل تھی جو ہر کسی کے سمجھ میں نہیں آسکتی تھی۔لہٰذا شیخ عبدالقادر،مولانا شیخ محمد حسین،اور رفیق میر احمد صاحب نے نظر ثانی کر کے اس کی مشکل عبارت کو آسان بنایا اور ضروری اضافہ کے ساتھ،۱۲۷۲ میں مطبع مصطفائی دہلی سے بار دوم منظر عام پر آیا۔پھر اس کو مطبع ہاشمی نے ۱۲۷۷ء میں شائع کیا،لیکن اس میں کسی طرح کی ترمیم نہیں کی گئی۔البتہ جب بار سوم ۱۲۷۸ھ میں مطبع سکندری بھوپال سے شائع ہوا، تب اس میں پھر ترمیم واضافہ کیا گیا۔ہمارے سامنے جو نسخہ ہے اس پر ملنے کے پتے درج ذیل لکھے ہیں۔شائقین وہاں سے اس کتاب کو حاصل کر سکتے ہیں۔ادارہ احیاء السنہ،گرجا گھر،گوجرانوالہ،پاکستان۔ادارہ احیاء السنہ،اُردو بازار،غزنی ٹرسٹ رحمان مارکیٹ،لاہور،ادارہ احیاء السنہ، کورٹ روڈ،مسجد اہل حدیث،کراچی۔[۲۶]

سبب تالیف

مولانا عبیداللہ نے لکھا ہے:

''پاپل کا یہ فقیر لڑکپن میں اپنے باپ کے جیتے جی گرفتار دین بت پرستی تھا۔ اتنے میں رحمت الٰہی نے ہاتھ پکڑ کر کھینچا،یعنی اسلام کی خوبیاں اور ہندوؤں کے دین کی قباحتیں میرے دل پر کھل گئیں اور دل وجان سے دین اسلام کو اختیار کیا۔پھر دوبارہ عقل خداداد نے مشورہ دیا کہ دین ومذہب کی

تحقیق میں ہی ہمیشہ کے آرام یا ہمیشہ کا عذاب موقوف ہے۔ بے تحقیق صرف باپ، دادا کی رسم سے گمراہی کے جال میں پھنسے رہنا کمال نادانی ہے۔پس یہ خیال کر کے مشہور اور روایتی دینوں کا حال دریافت کرنے لگا۔اور بدون رعایت کسی دین کے ہر مذہب میں فکر اور خوض کیا۔ ہندوؤں کے دین کو بخوبی معلوم کیا اور ان کے بڑے بڑے پنڈتوں سے گفتگو کی اور دین نصاریٰ کے اعتقاد کو بخوبی معلوم کیا۔ دین اسلام کی کتابیں بھی دیکھیں اور عالموں سے بات چیت کی۔ سبھی ادیان کو بنظر انصاف سوچا اور خوب چھانا، سب کو غلطی پر پایا، سوائے دین اسلام کے. آگے لکھتے ہیں کہ مدت سے خیال تھا کہ واسطہ فائدۂ عام کے بیان حقیقت دین اسلام اور ملت ہنود میں لکھا جاوے، جو کوئی صاحب عقل انصاف کی نظر سے دیکھے حق اور باطل اس پر کھل جاوے۔ سو الحمدللہ سن بارہ سو اڑسٹھ میں یہ مختصر مسمی بہ تحفۃ الہند ضبط تحریر میں لایا گیا۔''[۲۷]

یعنی یہ رسالہ حق اور باطل میں امتیاز کی غرض سے لکھا گیا ہے۔ضمناً یہ بھی عرض کر دوں کہ ہمارا بنیادی اور اہم فریضہ یہی ہے کہ ہم اسلام کی ترویج و اشاعت کی غرض سے اور رضائے الٰہی کے لیے دین کا کام کریں۔ نیز یہ بات بھی مدنظر رہے کہ اگر ہم کسی دوسرے مذہب یا افکار و نظریات پر خامہ فرسائی کر رہے ہیں تو اس میں بھی یہ پہلو غالب رہے کہ حق اور باطل واضح ہو جائے۔ تاکہ کوئی قاری کسی بھی طرح کی الجھن یا شکوک و شبہات میں مبتلا نہ ہو۔ اس کتاب کے مصنف نے بھی یہی پیغام دیا ہے کہ اس کو حق و باطل میں امتیاز و فرق کی غرض سے حوالۂ قرطاس کیا گیا ہے۔ چنانچہ فاضل مصنف کتاب کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں:

''ہندوؤں کے بزرگوں کی روایات اور حکایات اس کتاب میں لکھی گئی ہیں ایسے اور بہت قصے ان کی پوتھیوں میں مذکور ہیں۔ یہاں تھوڑے سے بطور نمونے کے لکھے گئے ہیں۔ لیکن گفتگو اور مباحثہ، کے بعد بعض ہندو ان حکایات سے صاف انکار کر جاتے ہیں اور اکثر اہل اسلام جو ان کی کتابوں

سے واقف نہیں ان کے جواب سے خاموش ہو جاتے ہیں۔''[۲۸]

لہٰذا اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے ہندو دھرم کے متعلق بہت سی نادر معلومات سامنے آئیں گی، نیز جب بھی علماء ہنود سے مناظرہ یا گفتگو کا موقع ہوگا تو یہ کتاب اس سلسلے میں کافی مدد کرے گی۔

اہم مباحث کا تجزیہ

کتاب کا پہلا باب عقیدہ توحید پر مبنی ہے۔ اس باب میں انھوں نے اسلام کا تصور توحید اور ہندو دھرم کا نظریہ توحید پیش کرنے کی جسارت کی ہے۔ اسلام نے توحید کا جو جامع اور مانع تصور پیش کیا ہے اس کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ البتہ توحید پر ایمان و یقین لانے سے فرد و شخص کے اندر آزادی و حریت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ متعدد خداؤں کی اتباع و اطاعت سے آزاد ہوتا ہے۔ اس کو صرف ایک رب کی مرضی کے مطابق اپنی زندگی کو استوار کرنا ہے۔ البتہ ہندو دھرم میں توحید کا یہ تصور قطعی نہیں پایا جاتا ہے۔ بلکہ ہر نفع اور نقصان کی چیز سے متاثر ہو کر اہل ہنود پرستش کرنا شروع کر دیتے ہیں جو نوع انسانی کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیتا ہے۔ اب مولانا عبید اللہ کی تحقیق کو دیکھیے۔ ہندوازم میں تصور خدا یا توحید کے حوالے سے مولانا عبید اللہ رقمطراز ہیں:

> ''جاننا چاہیے کہ از روئے دین ہندوؤں کے خدا دو طور پر ہیں۔ ایک نرگُن یعنی جس کی کوئی صفت نہیں۔ دوسرا سَرگُن یعنی صفتوں والا اور کہتے ہیں کہ نرگن اس وقت ہوتا ہے جب تمام مخلوقات فنا ہوتی ہے اور اس کی اس حالت کا بیان کچھ بھی نہیں ہوسکتا اور سرگن اس وقت ہوتا ہے جب اس کا پیدا کرنے کا ارادہ ہوتا ہے اور مایا کی جنبش ہوتی ہے۔ تو تین گن یعنی رج اورست اور تم اس میں ظاہر ہوتی ہے۔ رج کی جہت سے بشن (وشنو) کی صورت میں ظاہر ہو کر خلقت کو پیدا کرتا ہے۔ اورست کی جہت سے ظاہر ہو کر شیو کی صورت میں خلقت کو پالتا ہے۔ اور تم کی رو سے مہادیو کی صورت میں ظاہر ہو کر خلقت کو فنا کرتا ہے۔ گویا برہما، وشنو اور مہادیو یہ

تینوں دیوتے بقول ہندوؤں کے مظہر اور نائب خدا بلکہ ایک خدا کے تین خدا اور بالکل حاکم ومختار سارے جہاں کے ہیں۔''[۲۹]

یہ تصور ہے ہندوازم میں خدا کا۔ یعنی پیدا کرنے والا الگ ہے، ہلاک کرنے والا الگ اور رزق دینے والا الگ ان کو بعض دیگر مآخذ میں برہما، وشنو اور شیو بھی کہا گیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان تینوں دیوتاؤں کے متعلق ہندوازم کے مصادر میں کیا لکھا ہے اس پر گفتگو کی جائے۔ فاضل مصنف نے شیو پران کے حوالے سے وشنو دیوتا کے بارے میں درج ذیل حقائق کا انکشاف کیا ہے:

''سب سے پہلے وشنو کی ناف سے کنول کا پھول نکلا اسی میں سے برہما پیدا ہوا، برہما اور وشنو آپس میں جھگڑنے لگے، برہما نے کہا تجھ کو میں نے پیدا کیا ہے، وشنو نے کہا میں نے تجھ کو پیدا کیا ہے، اتنے میں آسمان سے ایک دھنواں ظاہر ہوا اس دھنواں میں سے برہما کو خطاب ہوا کہ تو برہما اور یہ وشنو ہے۔ جس کی ناف سے کنول نکلا اور اس سے نگاہ کی تو اس میں سے ایک لنگ یعنی آلت نظر آئیں، برہما ہنس کی شکل اس لنگ کی پیمائش کے لیے اوپر کو اڑا کر اور وشنو سور (خوک) بن کر پاتال کو گیا۔ دس ہزار برس تک دونوں دوڑے، پر اس لنگ کا انت تھا نہ پایا بس برہما نے جان لیا کہ میرا مالک اور پیدا کرنے والا یہی ہے۔ اس وقت سے اس لنگ کی پوجا شروع کی اور آج تک ہوتی ہے۔''[۳۰]

اس اقتباس کے ذیل میں مولانا عبیداللہ نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے اس کو قارئین کی دلچسپی کے لیے ذیل میں پیش کیا جارہا ہے:

''اس سے معلوم ہوا کہ برہما اور وشنو ایسے تھے جو آپس میں جھگڑنے لگے اور ہر کوئی اپنے آپ کو دوسرے کا پیدا کرنے والا جاننے لگا اور پھر برہما نے اپنے خالق کو پہچانا تو اس طرح پہچانا کہ ایک بڑے آلت کو بسبب درازی اس کو اپنا خالق سمجھ لیا اور دونوں مل کر اس آلت کی مقدار دریافت کرنے سے عاجز ہوگئے۔ اور آلت کا دریافت کرنا اور اس کے ناپنے میں اہتمام

کرنا عقل مندوں کا کام نہیں بلکہ مسخروں اور بڑے بے حیاء لوگوں کا کام ہے۔غرض ایسے شخصوں کو مظہر خدا بلکہ خدا کہنا محض گمراہی ہے۔''[۳۱]

اسی طرح بعض شاستروں میں ان تینوں کے متعلق غیر مناسب الفاظ کا بھی استعمال کیا گیا ہے:

چنانچہ اسگند پران کے حوالے سے فاضل مصنف رقم طراز ہیں'' وشنو کے درشن سے شیو یعنی مہادیو خفا ہوتا ہے۔اور مہادیو کی خفگی سے بلاشک بڑی دوزخ میں جاتا ہے۔میمانس شاستر میں لکھا ہے کہ خدا خالق نہیں بلکہ پیدا ہونا جہان کا کام یعنی اعمال میں سے ہے اور بعضوں کے نزدیک یعنی زمانہ سے پیدا ہونا جہان کا کام ہے۔''[۳۲]

اسی طرح خدا کے متعلق ہندوازم کے شاستروں، اور دیگر مآخذ میں لکھا ہے:

''جب کوئی شخص باغی و متکبر سرکشی شروع کر کے دیوتا وغیرہ کو تکلیف دیتا ہے تو خدا ایک شکل اختیار کرتا ہے، یعنی ایک جسم میں اترتا ہے۔اس واسطے اس کو اوتار کہتے ہیں۔بعضے کہتے ہیں کہ چوبیس مرتبہ خدا نے جسم اختیار کیا اسی وجہ سے ہندوازم میں دس اوتار بہت مشہور ہیں''۔[۳۳]

اب یہ اندازہ لگانا قطعی مشکل نہیں ہے کہ ہندوازم میں خدا سے متعلق جو عقیدہ ہے وہ نہایت بودا اور کمزور ہے۔لیکن اسلام نے توحید کا جو جامع تصور پیش کیا وہ اپنی جگہ آپ ہے، اس کے لیے قرآن کی سورہ اخلاص وغیرہ کو دیکھا جا سکتا ہے۔

کتاب کی عصری ضروت

اس کتاب کی اہمیت کئی اعتبار سے دو چند ہے۔ایک تو یہ کہ فاضل مصنف نے دونوں مذاہب کے بنیادی مسائل پر گفتگو کی ہے۔پھر دونوں میں باہم تقابل کر کے وجہ ترجیح اور ہندوازم کے کمزور نکات کو بیان کیا ہے۔اس کے علاوہ خط کشیدہ الفاظ میں جو اپنا نظریہ یا تنقید پیش کی ہے وہ انتہائی اہم بلکہ بحث کا لب لباب ہے۔اسی طرح اس کتاب کے مطالعہ سے اسلامی تعلیمات کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ، ہندو دھرم کی بھی اہم اور بنیادی تعلیمات سمجھنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ فاضل مصنف

نے ان چیزوں کو پیش کیا ہے، جن کا تعلق روزمرہ کی زندگی سے ہے۔ کیونکہ عقائد، عبادات، معاملات یہ زندگی کے وہ شعبے ہیں جن کو کسی وقت بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ اس کتاب کے مطالعہ سے ہندو دھرم کی بنیادی تعلیمات کا احاطہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہ کتاب فاضل مصنف کے ذاتی تجربات پر مبنی ہے۔ کیونکہ انھوں نے زندگی کا ایک حصہ اسی دھرم کا فرد ہو کر گزارا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس وقت کائنات کا ایک بڑا طبقہ درست اور صالح رہنمائی کا منتظر ہے۔ اس لیے ہمیں خود بھی اور اپنی نسلوں کو تیار کرنا ہوگا جو عوام کی پاکیزہ خطوط پر رہنمائی کر سکیں، نیز بھٹکتے ہوئے افراد کو منزل مقصود تک پہنچا سکیں۔ یہی ہماری ذمہ داری اور یہی ہمارا بنیادی و آئینی حق بھی ہے۔

الہنود

مرزا محمد کاظم برلاس مرادآبادی نے ہندوستان کی تاریخ پر ایک کتاب 'تاریخ الہند' کے نام سے مرتب کی ہے۔ اس کی تیسری جلد میں ہندوستان کے ہندوؤں کے احوال کو انتہائی شرح وبسط کے ساتھ رقم کیا ہے اور اس کا نام 'الہنود' رکھا ہے۔ اس کتاب کو مطبع گلزار احمدی مرادآباد نے ۱۸۶۷ء میں شائع کیا ہے۔ تقابل ادیان پر اردو زبان وادب میں ان گنت کتابیں مسلم مفکرین واسکالر نے تحریر کی ہیں۔ یہ کتاب ہندوؤں کے افکار، قدماء ہنود کے فرقے، عقائد، نظریات، فلسفہ، مقدس کتابیں، ہندومت کی برگزیدہ شخصیات اور رسم ورواج پر مشتمل ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اس کتاب میں ہندوؤں اور ان کے مذہب کی بابت جو مفید معلومات اردو زبان وادب میں ملتی ہیں شاید وہ کسی اور کتاب میں نہیں مل پائیں گی۔ اس کتاب میں اردو رسم الخط اور زبان پرانے زمانے کی استعمال کی گئی ہے۔ یہ بات واضح کر دی جائے کہ اس کتاب کی تصنیف وتالیف اور ترتیب وتزئین میں کن مصادر سے استفادہ کیا گیا ہے، اس کا ذکر تو ملتا ہے مگر اس طرح کہ 'دبستان مذہب' کے مصنف نے یہ لکھا اور 'بدیع ہندوستان' کے مصنف نے یہ لکھا ہے وغیرہ وغیرہ۔ البتہ کتاب کے پہلے صفحہ پر ثبت ہے کہ اس کی تصنیف میں دس برس کا طویل وقت صرف ہوا ہے۔ کتاب کے مباحث ومضامین انتہائی دلچسپ اور قابل مطالعہ ہیں۔ اس کتاب میں جن عناوین پر بحث کی گئی ہے وہ درج ذیل ہیں۔ اشاعت مذہب پوران، خلاصہ مضامین پوران، اوتار، عقائد اعمال ہنود، برہم چاریہ، شادی بیاہ، ہوم، حالات مرتاضان ہنود، پرستاران شیو، بیدانتیان، شنکر اچاری، ہر

رامپوری، دوارہ، اگم ناتھ، بیاس، حکایت دیگر، سانکھیان، مقاصد جوگ، سنیاسیان، شاکتی فرقہ، گشائین ترلوچن شاکتیہ، سدانند شاکتیہ، رامانج، بشنوان مادھوا چاریہ کا بہت بڑا فرقہ، بیراگیان، کبیر موحد، نام دیو بیراگی، چیتن، بلبہ سوامی، عقائد چارواگی، عقائد سراوگیان، عقائد سکھان، عقائد مختلفہ فقراء ہند، مداری، جلالیان، بینوا، ناکام، داؤد پنتھی، بشنوئی، فرقہ، سورج مکھی، عقائد قراتبیان، گائے کی پرستش، قربانی کی رسم، گائے کی قربانی وغیرہ وغیرہ کتاب کے مضامین پر نگاہ ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا کاظم نے ہندو قوم کے احوال وکوائف اوران سے وابستہ تمام بنیادی واہم باتوں کو پیش کیا ہے۔

اس تمہید اور تعارفی کلمات کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب اس کتاب کے بعض ضروری مباحث کو نذر قارئین کیا جائے۔

مصنف موصوف نے بدھ دھرم کی ترویج واشاعت اور ہندو دھرم سے باہم چپقلش کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''بودھ مذہب نے اپنے شیوع کے زمانہ سے برہمنی مذہب کے ساتھ جھگڑے اور تنازع کرتے کرتے آخر کار ایسی قوت حاصل کرلی کہ تخمیناً ایک ہزار برس تک ہندوستان میں اپنا رنگ جمائے رہا۔ اس ترقی کے زمانہ میں برہمنوں کا بالکل اعزاز گھٹ گیا۔ بودہ مذہب کا سب سے بنیادی اصول یہ تھا کہ تمام بنی آدم یکساں ہیں۔ سب کو برابر تعلیم دینا چاہیے۔ مذہبی امور میں سب برابر ہیں''[۳۴]

آگے لکھتے ہیں:

> ''آہستہ آہستہ لوگوں نے گوتم کی زندگی ہی میں اس کے مروجہ اصول میں دخل دینا شروع کردیا اور اپنی رائے شامل کرنے کا آغاز کردیا تھا۔ (جیسا کہ دیورت وغیرہ کی ترمیمیں نظر سے گزری ہیں) مگر گوتم بدھ کی زندگی کے بعد تو اس سلسلہ کی ایسی بنیادیں جمی کہ جس کا نتیجہ خاص مذہب کے واسطے بہت برا ہوا۔ چنانچہ دوسو برس کے اندر بدھ مذہب تمام نئے خیالات سے آمیز ہوگیا۔ اور یہ نئی باتیں بڑھتے بڑھتے اس قدر چھا گئیں کہ اصل اصول ملت

بالکل چھپ گئے۔ اور لوگوں کا عملدرآمد ہونا زیادہ تر ان نئی باتوں پر ہی رہ گیا۔ حالانکہ اس کے انسداد کے واسطے جلسے کیے گئے راجاؤں نے سختیاں بھی کیں مگر مذہبی آزادی کے سبب پورا پورا یہ رواج بند نہ ہوا۔''[۳۵]

آگے تحریر کیا ہے :

''ان نئے خیالات کی ترقی کے زمانہ میں برہمنوں کو موقع ملا اور تھوڑے تھوڑے دلائل عقلی سے مذہب بودھ کے پیروؤں کے دلوں میں (ان باتوں کی طرف سے جن کو وہ لوگ اپنا مذہبی اصول تصور کیے ہوئے تھے) شکوک پیدا کر دیے اور جب یہ شکوک پیدا ہو گئے تو مذہب کی بے وقعتی پیروؤں کے دلوں میں جم گئی اور کچھ کچھ لوگ اس عقیدہ سے برداشت خاطر ہو کر برہمنی ملت کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ اس موقع کو برہمنوں نے غنیمت جان کر تالیف قلوب کرنی شروع کی اور تالیف قلوب کے واسطے بھی کچھ نئے اصول قائم کرنے پر مجبور ہوئے اور ایک نیا مجموعہ تیار کیا گیا۔ اس نئے مجموعہ کا نام پوران رکھا گیا۔ برہمنوں نے اس وقت نئے طور پر اشاعت مذہب کرنی شروع کی یعنی پہلے وید کے عقائد سے اب کچھ بدل کر، پوران کے مضامین سے۔''[۳۶]

مذکورہ اقتباسات کے تناظر میں یہ کہا جا سکتا ہے ہے کہ مرزا کاظم کے مطابق۔ بودھ مذہب کی تبلیغی سرگرمیوں پر روک لگنے کی واحد وجہ تھی کہ اس مذہب کے متبعین نے اس کے اندر بہت کچھ نئی باتیں ایجاد و اختراع کر لی تھیں جس کی وجہ سے بودھ مذہب کی اشاعت دھیرے دھیرے کم ہوتی گئی اور اس موقع سے برہمنوں نے فایدہ اٹھا کر ان کے دل و دماغ میں شکوک و شبہات پیدا کر کے انہیں بودھ مذہب سے توڑ لیا اور اپنے مذہب/ ویدک دھرم کو پوران مذہب کے نام سے متعارف کرایا اور نئے سرے سے اپنے برہمن مت کی تبلیغ وارشاد کا کام انجام دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کے منظر نامہ پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ بودہ مذہب کے حاملین کی تعداد بہت کم ہے۔ اس کے علاوہ ہندو دھرم کے متبعین کی ایک بڑی تعداد ہند اور بیرون ہند موجود ہے۔ بودھ مذہب اور ہندو مذہب کی باہمی پرخاش کو بیان کرنے کے

بعد صاحب کتاب مرزا کاظم نے مذاہب وادیان کی اشاعت وعدم اشاعت پر انتھائی چشم کشا اور موجودہ دور سے مربوط تجزیہ کیا ہے:

''دنیا میں جس قدر مذاہب برباد اور ضعیف ہوئے ہیں اگر ان کے ضعف کا سبب دریافت کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ہر مذہب اور ملت کی کجی وخرابی کا باعث یہی نئی باتیں ہوتی ہیں جو دراصل مذہب سے الگ ہوتی ہیں، مگر پیروؤں کے برتاؤ میں آتے آتے ایسی قوی ہو جاتی ہیں کہ اصول ملت شکستہ اور ضعیف ہو کر انہیں پر دارو مدار نظر آتا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ مذہب و دین غیر مستحکم اور حقیر ہو جاتا ہے۔ اور ایسے لوگ اپنے مذہبی امور کے برتاؤ میں کم متوجہ ہو جاتے ہیں۔ آخر ایسے ہی ضعیف الاعتقادوں کی بدولت قوموں اور جماعتوں سے مذہب نکل جاتا ہے۔ اور لامذہب انسان رہ جاتے ہیں۔''[۳۷]

اس اقتباس کی روشنی میں تمام مذاہب وملت کے افراد کو اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھنا ہوگا کہ جو اصل پیغام مذہب و دین کا تھا عین اسی پر ملت قائم ہے یا اس نے اپنی ہوس اور آسانیاں حاصل کرنے کی وجہ سے دین ودھرم کے بنیادی اور اصل پیغام کو تو کہیں پس پشت نہ ڈال دیا ہے۔

مصنف موصوف ''شیو'' کے پرستاروں کے احوال کے متعلق لکھتے ہیں:

''قوم ہنود میں یوں تو ہمیشہ مرتاض لوگ ہوتے رہے ہیں، پرانے زمانے کی تاریخ ہند پر غور سے نظر کی جاوے تو معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے راجے جو بڑی بڑی حکومتوں کے مالک تھے ترک سلطنت کر کے گوشہ گزین اور خاک نشین بنے ہیں۔ کوئی زمانہ ایسا نظر نہیں آتا ہے جس میں کوئی صاحب دل قوم ہنود میں موجود نہ ہو، لیکن راجہ بکرم کی آٹھویں صدی سے سادھو سنتوں کی زیادہ کثرت ہونے لگی اور بہت سے اچاریہ پیدا ہو گئے، جن کے تعجب خیز حالات اور کرامتوں کے تذکروں سے اکثر کتابیں مملو ہیں۔ منجملہ ان کتابوں میں ایک کتاب 'بھگت مال' بہت مشہور ہے۔ قدمائے ہنود ان سنتوں اور اچاریوں کے ظہور کی بہت مدت قبل پیشین گوئی

بھی کر گئے تھے اور ان کی خاص کرامتیں یعنی کنواریوں سے پیدا ہونا، شیروں سے لڑکر مغلوب ہونا، ہوا میں اڑ جانا۔ آدمیوں کی نظر سے یکا یک غائب ہوجانا، پہاڑ اٹھانا، عمیق دریا میں مثل خشک زمین کے ہوجانا۔''[۳۸]

یہ خصوصیات 'شیو' کے متبعین اور عابدوں کی بیان کی گئی ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ قاری کے لیے ہندوازم کے فرقوں، شخصیات اور رسم ورواج کی معلومات کا مرقع ثابت ہوگا۔ بیدانتیان فرقے کے احوال میں صاحب کتاب نے انتہائی دلچسپ باتیں رقم کی ہیں اور بتایا ہے کہ بت پرستی سے اس فرقہ کا کیا منشا تھا۔

''بت پرستی کا منشا ان کے نزدیک صرف فرشتوں کو مطیع اور راضی کرنا ہے۔ اس طائفہ کا قول ہے کہ نفس ناطقہ انسان ایک فرشتہ ہے بس بت پرستی صرف اسی فرشتہ کو مطیع کرنے کے واسطے کی جاتی ہے۔''[۳۹]

اس کتاب میں مرزا کاظم نے اگم ناتھ شخص کے احوال میں رقم کیا ہے:

''اگم ناتھ ایک جوگی تھا، ہند میں بڑا مرتاض اور صاحب دل گزرا ہے، اس کے شاگردوں کا قول ہے کہ اس کو حیات ابدی حاصل ہے، بلکہ اس کی عمر کے ابھی دس ہزار برس گزرے ہیں۔''[۴۰]

رامانج کے احوال کے متعلق لکھتے ہیں:

''یورپین مورخوں کی تحقیقات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شخص جس نے سب سے پہلے ''وشنو'' کی پوجا کا اعلان کیا اور وعظ کہا اور لوگوں کو تعلیم دینی شروع کی اس کا نام ''رامانج سوامی'' تھا۔ معلوم ہوتا ہے کتب ہنود میں اس سے قبل اس امر کے واسطے کوئی شخص مخصوص نہیں ہوا نہ کسی کا حال معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا اسی شخص کو بانئ پرستش ''وشنو'' تصور کرنا چاہیے۔ اس شخص کے ان وعظوں کا پتہ (جو اس نے وشنو کی پوجا کے بارے میں متفرق مقام پر بیان کیے تھے) تخمینا بارہویں صدی عیسوی کے وسط کے قریب پایا جاتا ہے۔ اس نے تعلیم کیا کہ ''وشنو'' خالق کائنات اور علت اولی عالم کی ہے۔ چونکہ

یہ ''وشنو'' کی خدائی کا قائل تھا لہٰذا اس کے یہ خیالات سن کر بعض راجہ جو اس عقیدے کو برا جانتے تھے اس کی ایذا رسانی پر مائل ہوئے۔ دکن کا ایک راجہ جو 'کول' خاندان کا تھا اس کا دشمن ہوا اور اس کے جَور سے اسے ترک وطن کرنا پڑا۔''[۴۱]

مرزا کاظم کی تحقیق کے مطابق قدماء ہنود میں ایک فرقہ کا نام سورج مکھی ہے۔ اس کے متعلق صاحب کتاب نے لکھا ہے:

''یہ فرقہ قدماء اہل ہند سے ہے۔ چونکہ آفتاب پرست ہیں لہٰذا ہندی زبان میں ان کو سورج مکھی کہا جاتا ہے۔ ان کے دو فرقے ہیں ایک وہ ہیں جو آفتاب کو جمیع ملائکہ بزرگ تر فرشتہ تصور کرتے ہیں۔ اور دوسرا گروہ پہلے سے بڑھ کر آفتاب کا مرتبہ سمجھتا ہے''[۴۲]

کتاب کا مطالعہ بتاتا ہے کہ صاحب کتاب نے ہندوستان کے قدماء ہنود کے تمام احوال وکوائف کو قلمبند کیا ہے۔ اس طرح اس زمانے میں اس کتاب کی اہمیت وافادیت کئی اعتبار سے بڑھ جاتی ہے۔ ایک تو یہ کہ کتاب کو پڑھنے سے ہندوستان کے قدیم مذہب ہندومت سے وابستہ قدیم لوگوں کے عقائد ونظریات، افکار وخیالات کا مکمل طور پر احاطہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس زمانہ میں ہندومت میں جو فرقے اور اس مذہب کی برگزیدہ شخصیات پر بھی بڑی تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ دوسری اہم بات یہ کہ اس کتاب کے مطالعہ سے ہندوستان کی قدیم تاریخ، معاشرت، تہذیب اور کلچر وثقافت بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس اعتبار سے یہ کتاب قدماء ہنود کے جملہ حالات پر ایک اہم ترین دستاویز ہے۔ اس کے مطالعہ سے اردو داں طبقہ کے اندر توسع اور فکری اقدار روشن ہوں گی۔ نیز وہیں اس بات سے بھی قطعی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ کتاب کے مطالعہ سے ہندوازم کی خاصی اور وقیع معلومات حاصل ہو جائیں گی۔ اس طرح ہمارے رشتوں کو ایک بار پھر تازگی اور روحانیت نصیب ہوگی اور ملک میں باہم ہندو مسلم اتحاد کی علامت ثابت ہوگا۔ مرزا کاظم نے لکھا کہ برلاس مرادابادی نے کہیں بھی کسی واقعے یا تاریخ وتہذیب کو بیان کرتے ہوئے ہندوازم کو کسی بھی مسئلہ پر بے جا تنقید کا نشانہ نہیں بنایا ہے۔ البتہ کہیں کہیں انھوں نے مذہب اسلام کی تعلیمات کے تناظر میں تقابل کرنے کی سعی ہے۔

ہندو اخلاقیات

سناتن دھرم/ ہندومت میں ایک دین کا نام ہے۔اس میں بھی حسن اخلاق کا مکمل نظام موجود ہے۔معاشرتی اور سماجی طور پر لوگوں سے کس طرح کا رویہ اپنایا جائے،اس دھرم کی اخلاقیات کیا ہیں؟اس سلسلہ میں ہندو مذہب کی متون مقدسہ میں باقاعدہ حسن اخلاق کی تعلیم ملتی ہے۔ہندو اخلاقیات پر معروف مصنف 'جی-اے چنداور کر' نے ایک قابل مطالعہ اور انتہائی اہم تصنیف 'ہندو ایتھکس' کے نام سے لکھی ہے۔یہ اصل کتاب تو انگریزی زبان میں ہے مگر اس کا اردو ترجمہ ''مولوی غلام ربانی صاحب مدرس مدرسہ نارمل اسکول اورنگ آباد'' نے کیا ہے۔اس ترجمہ کو 'ہندو اخلاقیات' کے نام سے دکن لا رپورٹ پریس جام باغ حیدرآباد نے شائع کیا ہے۔اردو ترجمہ پر سن اشاعت مذکور نہیں ہے۔البتہ صاحب کتاب نے جو مقدمہ تحریر کیا ہے اس میں جنوری ۱۹۱۷ء کی تاریخ رقم ہے۔اس سے قیاس یہی لگایا جاسکتا ہے کہ اس کتاب کا ترجمہ بھی انہی تاریخوں میں ہوا ہوگا۔نیز اسی دوران شائع بھی ہوا ہوگا۔دارالترجمہ حیدرآباد کے رکن'' سید ہاشم فرید آبادی'' نے مولوی غلام ربانی صاحب کے ترجمہ پر ایک مختصر دیباچہ تحریر کیا۔انھوں نے دیباچہ کے آخر میں ۲۰/ ربیع الاول ۱۳۴۵ھ سن درج کی ہے۔اس کتاب کے مفید اور اہم مباحث پر روشنی ڈالنے سے قبل معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جن چیزوں پر بحث کی گئی ہے ان کو پیش کر دیا جائے۔

چنانچہ یہ کتاب چودہ ابواب ایک دیباچہ اور ایک مقدمہ پر مشتمل ہے۔کتاب کے ابواب کے درج ذیل موضوعات ہیں:

ویدوں کی اخلاقی تعلیمات،اپنشدوں کی اخلاقی تعلیم، ہندومت کے چھ فلسفوں کے مکاتب،منو کے اصول اخلاق۔ والمیکی کے اصول اخلاق،مہابھارت کے اصول اخلاق، ودور کے اصول اخلاق، چانکیا کے اصول اخلاق،شنکر اچاریہ کے اصول اخلاق، بھگوت گیتا کے اصول اخلاق، بودھ کے اصول اخلاق، ہندوؤں کا اخلاقی مذہب، ہندو رشیوں کا عقیدہ للّٰہیت، بنابریں اس کتاب کی اہمیت وانفرادیت سے قطعی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

اس کتاب کے اندر انتہائی خوش اسلوبی سے ہندو دھرم کی اخلاقی تعلیمات کو اجاگر کیا گیا ہے۔یہ سچ ہے کہ حسن اخلاق اور روادارانہ سلوک و برتاؤ کی تعلیم دنیا کا ہر مذہب دیتا ہے۔حسن اخلاق

ایسا جوہر ہے جس کے ذریعہ ہر معاشرہ اور قوم دنیا میں اپنی شناخت وامتیاز بناتا ہے۔ جو سماج حسن اخلاق یا علم الاخلاق کے زیور سے آراستہ نہیں ہوتا ہے اس کی روئے زمین پر یا دیگر مہذب ومتمدن معاشروں میں کوئی وقعت وتوقیر نہیں ہوتی ہے۔ تہذیب وشائستگی سے مزین معاشرے اور حسن اخلاق وکردار سے متصف افراد کا امتیاز یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے پاکیزہ کردار سے دیگر قوموں کے دل پر حکمرانی کرتے ہیں۔ اس لیے آج کے نفرت آمیز معاشرے میں اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ہم بذات خود اور اپنی نسلوں کو بھی حسن اخلاق سے پیراستہ ہونے کی پرزور تعلیم دیں۔ تمام مذاہب وادیان بھی اس بات پر متفق و یک رائے ہیں کہ حسن اخلاق اور خندہ پیشانی سے پیش آنا معاشرہ کی تعمیر وترقی، صالح ونیک خطوط پر تشکیل کی روشن وتابناک علامت ہے۔ ہندو مذہب کی اخلاقیات پر یہ کتاب مشتمل ہے، اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ان افراد کو مسکت ودندان شکن جواب مل جائے گا جو یہ کہتے ہیں کہ ہندو مذہب میں اخلاقیات کا کوئی تصور نہیں ہے۔ مصنف نے حسن اخلاق کے تمام گوشوں کو ہندوازم کے مستند مصادر کے تناظر میں پیش کرکے ہندوستان جیسے تکثیری سماج میں ایک مثبت پیغام دینے کی کامیاب کاوش کی ہے۔

صاحب کتاب نے مقصد تالیف وتصنیف کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''ہندو نوجوانوں کو مذہبی اور اخلاقی تعلیم دینے کی جو زبردست ضرورت ہے اسے اکثر مصلحین تعلیم تسلیم کر چکے ہیں۔ اس واقعہ سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اس راستہ کی دقتیں بہت کچھ زبردست ہیں۔ غیر فرقہ واری مدارس میں تو یہ مسئلہ اور زیادہ ناقابل حل ہے۔ ذاتوں کے اختلاف اور مسائل کے تضاد کی وجہ سے یہ سوال اتنا پیچیدہ ہوگیا ہے کہ اکثر اوقات ماہرین تعلیم بھی اس کی کامیابی کی طرف سے مایوس ہوگئے ہیں۔ نیت اور ارادہ خواہ کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو لیکن مجبوراً ہر شخص کو یہی کہنا پڑتا ہے کہ 'مذہب میں دخل ہی نہ دو' لیکن اندیشہ ہے کہ کہیں یہ بے پروائی آگے چل کر برباد کن ثابت نہ ہو۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندو نوجوانوں کو شروع ہی سے اپنے مذہب کے اصول اور اس کی تاریخ سے واقف کرایا جائے۔ اس کے لیے مناسب درسی کتابوں کی ضرورت ہے۔ ہماری رائے میں

ایک ایسی درسی کتاب جو شاگرد اور استاد کے سامنے ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کے منتخب اقتباسات پیش کرتی ہو، جن کی حیثیت اخلاقی ہو، موجودہ تالیف اسی قصد کے پیش نظر کی گئی ہے۔''[۴۳]

آگے رقم طراز ہیں:

''ہم اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہیں کہ صرف درسی کتابوں سے یا روزانہ دس پندرہ منٹ تک جماعتوں میں اقوال رٹانے سے ہندو نوجوانوں کی اصلاح ونجات نہیں ہوسکتی۔ اس کا انحصار زیادہ تر اس بات پر ہے کہ کہ گھر اور مدرسہ کے اثرات صحیح تر ہوں۔ ان کتابوں کی حیثیت ہندو دینیات پڑھانے والوں کے لیے کم وبیش ایک رہبر کی سی ہوا کرتی ہے۔ جماعتوں میں مذہبی تعلیم دیتے وقت ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کی اخلاقی اہمیت پر زیادہ زور دینا ہمیشہ بہتر ہوتا ہے۔ جہاں تک اخلاقیات کا تعلق ہے اس میں زیادہ متضاد مسائل بھی نہیں پائے جاتے ہیں۔ اخلاق کے اساسیات اصول تمام فرقوں، ذاتوں، اور ذیلی ذاتوں سب کے لیے ایک ہیں۔''[۴۴]

اسی طرح مصنف مزید لکھتے ہیں کہ نیچے کی جماعتوں میں ہندو شاستروں کے ایسے قصوں کو بیان کیا جائے جن سے مختلف نیکیوں کی توضیح ہوتی ہے۔ اس کتاب میں جن عبارتوں کا انتخاب کیا گیا ہے اس کے سمجھانے کے لیے ہندو رزمیہ نظموں، رامائن، مہابھارت، اور پرانوں سے کافی مواد مل سکتا ہے۔

مذکورہ اقتباس کے تناظر میں کہا جاسکتا ہے کہ مصنف موصوف نوجوان نسل کے اخلاق کو صالح خطوط پر استوار کرنے کے خواہاں ہیں اور وہ اس بات کی پرزور وکالت کرتے ہیں کہ جن اسکولوں اور کالجوں میں ہندو دینیات کی کتابیں شامل ہیں ان میں ہندو مذہب کی ان محترم شخصیات کی زندگی کے واقعات کو پڑھایا جائے جن کی زندگی سماج اور معاشرے کے لیے فال نیک تصور کی جاتی ہے۔ شریفانہ اور اور صالح اخلاق کے درس سے ہندو معاشرہ میں رواداری اور بھلائی وخیر کا پیغام عام ہوگا اور موجودہ زمانے میں اس کی ضرورت بھی ہے۔ ایسے نصاب کے فوائد کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ہندو نوجوان اوائل عمری سے اعلیٰ تعلیمات سے اور شریفانہ خیالات کی فضاء میں سانس لینا شروع کریگا اور اس میں مدنی نیکیوں کی بنیاد گہری اور مضبوطی کے ساتھ پڑ جائے گی، وہ سچی اکابر پرستی اور اپنے ابنائے جنس کے ساتھ حقیقی محبت کرنے کے اصول سیکھے گا اور معاشرتی حیثیت سے نیک، اخلاقی اعتبار سے تندرست اور روحانی حیثیت سے بڑا بننے کے زیادہ قابل ہوگا۔''[۴۵]

گویا سماج میں ہندومت کی اخلاقی اور روحانی تعلیمات کے فروغ سے معاشرے میں باہم امن وامان، محبت و پیار کی فضا ہموار ہوگی اور پھر ہندو معاشرے میں نوجوانوں کی ایسی نسل تیار ہوگی جن کے اندر انسانیت کا جذبہ غالب ہوگا۔ اسی مقصد کے تحت اس کتاب کی 'جی اے چنداور کر' نے تصنیف کی ہے۔

ہندو متون مقدسہ میں ویدوں کو خاص مقام حاصل ہے۔ مصنف نے ویدوں کے حوالہ سے اس کتاب میں ان شلوکوں اور منتروں کو پیش کیا ہے جو اخلاقی تعلیمات کا مرقع ہیں۔

اتھر وید کے حوالے سے لکھا ہے:

''خیرات میں دوہری برکت ہوتی ہے، لینے والا بھی ماجور ہوتا ہے، اور دینے والا بھی۔''[۴۶]

اتھر وید کے دوسرے منتر میں مذکور ہے۔

''پہلے مستحق مہمان کو دے لو، اس کی مہمان نوازی کرلو تب خود کھاؤ۔''[۴۷]

اسی طرح رگ وید کے منتر میں ملتا ہے۔

''ارحم الراحمین! تو تمام طاقت کا سرچشمہ ہے، ہم سے بدی، افلاس، کمزوری، ناعاقبت اندیشی، سرد مہری، نفرت، بدخواہی اور تمام (نقائص) معائب کو دور کردے۔''[۴۸]

اسی طرح تقریباً چاروں ویدوں کے چونتیس منتروں کا ذکر کرکے یہ بتانے کی سعی کی ہے کہ ہندومت کے بنیادی مصادر وید اعلیٰ اخلاقی تعلیم کا شاندار مرقع ہیں۔ صاحب کتاب نے ماہر ہندومت

پروفیسر میکس ملر کے حوالے سے لکھا ہے:

''وید میں ذہن انسانی کے ہر پہلو کا فطری عکس نظر آتا ہے۔ یہی وہ آریائی کلام ہے جو آریائی آدمی کی زبان سے نکلا، اس کا تعلق تاریخ عالم اور تاریخ ہندوستان دونوں سے ہے۔ جب تک انسان کو اپنی نسل کی تاریخ کے ساتھ دلچسپی باقی ہے اور وہ اپنے کتب خانوں اور عجائب خانوں میں ازمنہ گزشتہ کے آثار جمع کرتے رہیں گے، اس وقت تک رگ وید کو کتابوں کی اس لمبی قطار میں ہمیشہ پہلی جگہ دی جائے گی۔ قدیم مذہبی خیالات کے اس خزانہ کو اپنشدوں کے رشیوں نے اپنے بزرگوں سے ورثاء میں پایا تھا۔ اور انھوں نے اسی قدیم بنیاد پر وید کی عمارت کھڑی کی جو نہایت اعلیٰ فلسفہ ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کا طمانیت بخش مذہب یعنی ویدانت بھی تھا۔''[۴۹]

اپنشدوں کے متعلق صاحب کتاب نے لکھا ہے۔ اپنشد سنسکرت ادب میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اور ویدک فلسفہ کا لب لباب انہی میں ملتا ہے۔ ان کے اندر کائنات کے متعلق فلسفیانہ گفتگو کی گئی ہے۔ چنانچہ ان میں بھی صالح اخلاق کا جامع تصور پیش کیا گیا ہے۔ ''تے تریا اپنشد'' میں مذکور ہے۔

''سچ بولو، نیکی کی زندگی بسر کرو، اپنے فرائض کو قابل اطمینان طور پر انجام دو، نکوکاری، صادق القول اور راست کرداری کو ہرگز ترک نہ کرو اور نیک کرداری کے راستہ کو ہرگز نہ چھوڑو''[۵۰]

اپنی ماں کا احترام کرو۔

''ایسے کام کیے بغیر نہ رہو جن سے تمہارے والدین یا داداؤں کو مدد ملتی ہے، اپنے مہمان سے مہمان نوازی سے پیش آؤ۔''[۵۱]

والمیکی کے اصول اخلاق کے حوالے سے لکھا ہے:

''انسان ایک مدنی الطبع ہستی ہے اور اسکی روزانہ کی زندگی اپنے ابنائے جنس کی با معاوضہ یا بلا معاوضہ خدمات کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر ہم زندگی کی اس جنگ سے عہدہ برآ ہونا چاہتے ہیں تو ہمارا سب سے پہلا فرض یہ

ہونا چاہیے کہ اپنے اعزہ و احباب اور بالادستوں کے ساتھ جائز برتاؤ سیکھیں۔اس بارہ میں اپنی ذمہ داریوں کومحسوس نہ کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ ہم زندگی میں بھی بالکل ناکام ہیں۔رامائن میں عاقلانہ نصائح اور شریفانہ نظائر پیش کرکے ہمیں یہ سکھایا گیا ہے کہ بیٹے کی حیثیت سے اپنے والدین کی اطاعت ، بھائی ہونے کے اعتبار سے ایک دوسرے سے محبت ،بحیثیت دوست کے آپس کی مدد،نوکر ہونے کے اعتبار سے اپنے مالکوں کی خدمت اور حاکم ہونے کی حیثیت سے،محکوم نسلوں پر حکومت کس طرح کرنی چاہیے۔ ہماری اس دنیا میں جس کی کوئی کل بھی سیدھی نہیں ہے ،ایسے مواقع کچھ شاذ نہیں بلکہ اکثر پیش آجاتے ہیں کہ اس بہادر سے بہادر اور عقلمند سے عقلمند آدمی بھی اپنے لیے ایک راہ راست معلوم کرنے کی کوششوں میں بہک جاتا ہے۔ایسے اہم موقعوں پر رامائن کا مطالعہ ان میں جوش اور سرگرمی پیدا کرے گا۔''[۵۲]

یعنی سماج میں جس کی عزت و وقعت ہے اسے نبھانے کی کوشش کی جائے۔سماج کے ہر فرد کے ساتھ حسن سلوک اور اچھے اخلاق سے پیش آیا جائے تاکہ معاشرہ میں ہر فرد اور طبقے کے اقدار کو روشن سمت مل سکے۔

رامائن میں ''رام'' کے متعلق مذکور ہے:

''جب وقت آیا اور رام نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو اس نے دانائی اور ہمدردی سے حکومت کی ،وہ عامۃ الناس کی رائے کی یہاں تک وقعت کرتے تھے کہ صرف ایک دھوبی کا یہ ملامتی فقرہ کہ'' تم اپنی بیوی کو راون کے محل سے واپس لائے ہو،اسے متنبہ کرنے کے لیے کافی تھا'' رعایا اس کو اپنے باپ کے برابر سمجھتی تھی ،وہ دور حکومت ہمدردی اور انصاف کا عہد تھا، جو رحم سے سمویا ہوا تھا۔راون کے مغلوب ہونے کے بعد اس نے راون کے بھائی بھبھیشن کو اس کا جانشیں کردیا اور تمام جاگیر دار اس کے

ایسے مطیع رہے کہ باید وشاید ہمدردی اس کی حکومت کی جان تھی۔ مفتوحہ ملک کو ملحق نہ کرنے کی پالیسی جو اس نے پیش کی ہے، وہ گویا ایک دعوائے فخر ہے جو ہندی تہذیب دوسری قوموں کے جوع الارض کے مقابل میں ہمیشہ کرتی رہے گی۔''[۵۳]

اس اقتباس میں رام کی حکومت کا جو پاکیزہ اور دوستانہ کردار پیش کیا گیا ہے اس سے موجودہ حکومت کو سبق لینے کی سخت ترین ضرورت ہے۔ کوئی بھی حکومت اسی وقت مقبول ہو سکتی ہے جب اس کا رویہ تمام اقوام وملل کے ساتھ عدل وانصاف اور مساوات پر قائم ہو۔ دنیا کی تاریخ شاہد عدل ہے کہ حکومتوں نے جب جب انصاف کا دامن چھوڑا ہے اس وقت عوام نے اپنے حقوق کی بازیافت کے لیے آواز بلند کی ہے۔ اس لیے حکومتوں کو ان سیاسی اخلاقیات کو اپنانے کی ضرورت ہے جن سے عوام میں اعتماد اور خوشحالی وفراوانی کی راہ ہموار ہو سکے۔ گیتا کے اصول اخلاق کے باب میں مصنف نے آرنلڈ کے حوالے سے تحریر کیا:

''یہ کتاب سادہ لیکن عمدہ زبان میں اس نظام فلسفہ کو آشکار کرتی ہے جو آج کے دشک میں رائج الوقت برہمنی عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ اس وجہ کہ اس میں پنتجلی، اور ویدوں کے مسائل کا امتزاج کیا گیا ہے۔ اس کے اکثر بیانات اس قدر بلند، آرزوئیں ایسی رفیع اور تقوی اتنا نازک اور پاکیزہ ہے کہ اس نظم کے مطالعہ کے بعد انسان کیف مسرت سے چلا اٹھتا ہے۔''[۵۴]

اس کے علاوہ صاحب کتاب نے لکھا ہے:

''اس میں جو اخلاق بتائے گئے ہیں وہ اس قدر پر اثر اور اس کی تعلیمات اور عہد نامہ جدید (انجیل) کی تعلیمات میں اتنا گہرا اور بسا اوقات لفظی تطابق پایا جاتا ہے کہ آج پنڈتوں اور مشنری عیسائیوں کے درمیان یہ مسئلہ مابہ النزاع بن گیا ہے کہ آیا اس کے مصنف نے عیسائی ماخذوں سے مطالب اخذ کیے ہیں یا جامعان انجیل اور حواریوں کے یہ مطالب خود اس سے اخذ کیے گئے ہیں۔''[۵۵]

اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت طشت از بام ہوتی ہے کہ ہندو مذہب میں حسن اخلاق کے مستند وٹھوس شواہد موجود ہیں۔لہٰذا ان حقائق کا تقاضا یہ ہے کہ آج ہندو مذہب سے وابستہ ایک طبقہ جو بظاہر اپنے آپ کو ہندتوا اور ہندوؤں کا مسیحا کہتا ہے، اس کو ہندو مذہب کی ان روشن اخلاقیات کا مطالعہ کرنا ہوگا اور ان کو اپنے ایجنڈے میں شامل وداخل کر کے اپنے متبعین کو بتانا ہوگا کہ ہندو مذہب کی تعلیمات بھی معاشرہ کو جوڑنے اور باہم مل جل کر رہنے کی ہدایات دیتی ہیں۔آج ہمارے معاشرے میں کچھ افراد اور مخصوص فکر کے حاملین ہندو دھرم کو بلا وجہ بدنام کر رہے ہیں، جب کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم معاشرے سے نفرت وتشدد کی فضا کو معدوم کریں، نیز معاشرے میں امن وسلامتی، صلح وصفائی اور حسن اخلاق جیسی روایات کو فروغ دیں۔ ہندو مذہب کے حاملین پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے مذہب کو کسی بھی طرح کی بدنامی سے بچائیں۔ ہندو مذہب کی ان اقدار کو دوبارہ معاشرہ میں بحال کرنا ہوگا جن سے ہندو دھرم کی مثالی حیثیت ظاہر ہو سکے۔ مذکورہ کتاب میں ہندو مذہب کی اخلاقیات کو پیش کر کے صاحب کتاب نے ایک مستحسن اور مفید قدم اٹھایا ہے۔امید ہے کہ اس کتاب اور مضمون سے تحریک پا کر معاشرہ میں سنجیدگی اور بقائے باہم کی راہ ہموار ہوگی۔

منو کا قانون اور اسلامی قانون

اردو ادب میں ایک اور انتہائی اہم اور انوکھی کتاب مفتی سید عبدالقیوم جالندھری نے 'منو کا قانون اور اسلامی قانون' کے نام سے تصنیف کی ہے۔اس کتاب کو سید محبوب عالم لٹن روڈ لاہور، نے ۱۹۶۸ء میں شائع کیا ہے۔اس کتاب میں قوم ہندو کے قدیم قانون منو اور قدیم تہذیب کا موازنہ اسلامی تہذیب اور قانون اسلامی سے کیا گیا ہے۔ یہ بات بتانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ ہندومت کی ایک فقہی کتاب 'منو دھرم شاستر' کے نام سے ملتی ہے، اس کتاب میں منو مہاراج نے ہندوؤں کے تقریباً تمام فقہی مسائل کا احاطہ کیا ہے۔'منو دھرم شاشتر' کا اردو ترجمہ بھی آچکا ہے۔

سید مفتی عبدالقیوم جالندھری نے اس کتاب کو ۸۷ عناوین ومضامین اور ایک دیباچہ پر منقسم کیا ہے۔قارئین کی دلچسپی کی وجہ سے بعض اہم عناوین کو قلم بند کرنا نہایت مناسب ہوتا ہے۔

قدیم قوانین، منو کا قانون، ہندوستان کی قدیم مہذب اقوام، قوم ہندو کا ہندوستان میں

ورود، قوم ہندو کی تہذیب اور عقائد، قوم ہندو میں ویدک تہذیب کا عہد، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انسانی مساوات پر خطبے، غلامی، قانون منو میں غلاموں کی اقسام، اسلامی قانون میں غلاموں سے حسن سلوک، وراثت، قانون منو میں منجھلے اور چھوٹے بیٹے کی محرومی، اسلامی قانون میں بیٹے کی وراثت، قانون منو میں قومیت کے لحاظ سے بیٹوں کی وراثت، اسلامی قانون میں سب بیٹے برابر ہیں، جرائم کی تعزیرات، قانون منو میں سزا کے اقسام، اسلامی قانون میں سزا کے اقسام، جرم قتل کی سزا، قانون منو میں برہمن مجرم قتل کی سزا سے مستثنیٰ ہے، قومیت کے لحاظ سے قتل کی سزا، اسلامی قانون میں قومی اور قبائلی تفریق کے بغیر قتل کی سزا، جرم زنا کی سزا، قانون منو میں جرم زنا کی سزا مجرم کی قومیت کے اعتبار سے کم یا زیادہ ہے، برہمن عورت سے زنا کی سزا عضو تناسل قطع کرنا ہے، اسلامی قانون میں جرم زنا کی سزا میں مجرم کی قومیت کا لحاظ نہیں کیا جاتا ہے، جرم سرقہ کی سزا، قانون منو میں جرم سرقہ کی پانچ سزائیں، قطع عضو بھی ایک سزا ہے، شہادت، قانون منو میں جرم قتل کی سزا سے بچانے کے لیے جھوٹی شہادت دینا دیوتا کی قربانی کے برابر ہے، قانون منو میں مردوں عورتوں وغیرہ کے لحاظ سے گواہوں کی شہادت، اسلامی قانون میں اس قسم کی کوئی تخصیص نہیں اور جھوٹی شہادت دینا بڑا گناہ ہے وغیرہ جیسے اہم اور بنیادی مسائل پر سید مفتی عبدالقیوم جالندھری نے انتہائی عالمانہ اور محققانہ گفتگو کی ہے۔

سبب تالیف

سید مفتی عبدالقیوم جالندھری نے اپنی کتاب 'منو کا قانون اور اسلامی قانون' پر عالمانہ دیباچہ تحریر کیا ہے۔ وہ کتاب کے دیباچہ میں کتاب کا سبب تالیف درج ذیل بیان کرتے ہیں:

> ''میں اصول فقہ لکھ رہا تھا اسی اثناء قدیم قوانین کا خیال آیا، سب سے پہلے دوہزا رسال قبل مسیح میں بابل کے بادشاہ حمورابی نے پتھر کے مینار پر قوانین کندہ کرائے، اس پتھر کا کچھ حصہ اہل فرانس نینوا سے فرانس لے گئے، اب وہ ان کے عجائب خانے میں ہے۔
>
> پانچویں صدی قبل مسیح میں روم کبیر میں تانبے کی بارہ تختیوں پر قوانین کندہ کرایے گئے۔ ۸۸۰ برس قبل مسیح میں قوم ہنود کے بادشاہ منو نے اس قوم

کے لیے قوانین وضع کیے، اس قوم کی تہذیب وعقائد اور منو کے قانون کے چند احکام کا اسلام کی تہذیب وعقائد اور قانون سے موازنہ کیا تو ثابت ہوا منو کا قانون عقل وعدل اور انسانی فطرت کے مخالف اور لغو ہے۔ اسلامی تہذیب وعقائد اور قانون عقل وعدل اور انسانی فطرت کے موافق ہے۔ منو کا قانون صرف ہندو قوم کے لیے مخصوص ہے۔ اسلامی قانون سبھی نوع انسانی کے لیے یکساں ہے، منو کا قانون قدیم نہیں ہے، اس قوم کے رسم و رواج اور وید وغیرہ اس قانون کے اصلی ماخذ بتائے جاتے ہیں، وید خود ازلی نہیں ہیں۔ جب اس قوم نے تمدن میں ترقی کر کے اپنی ریاستیں قائم کر لیں تو یہ کتابیں اس زمانے کی ہیں۔''[۵۶]

مصنف نے اس اقتباس میں سبب تالیف بیان کرنے کے ساتھ ساتھ کئی اہم نکات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ منجملہ ایک یہ ہے کہ ہندوؤں کا مقدس دینی ادب ازلی نہیں ہے۔ مصنف کی اس رائے سے ہم خیال وموافق بہت سے اہلِ علم ہیں جنھوں نے یہ دعویٰ کیا ہے ہندو قوم کا دینی ادب جنھیں وید کہا جاتا ہے وہ ازلی نہیں ہے۔ حتی کہ بعض علماء ہنود بھی اس رائے سے اتفاق کرتے نظر آتے ہیں۔ اگر مستشرقین کی بات کریں تو پتہ چلتا ہے کہ موکس مولر نے بھی اسی کے قریب قریب بات کہی ہے۔ لہٰذا ان تمام تفصیلات کا یہاں موقع نہیں ہے۔ البتہ اس سلسلے میں پوری تفصیل دیکھنی ہو تو راقم کا ایک غیر مطبوعہ مقالہ ہے ''ھندومت ایك تعارف'' موافقین ومخالفین کی تقریباً تمام آراء کو قلم بند کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

ہندوستان کی قدیم قوموں کی تہذیب

سید مفتی عبدالقیوم جالندھری لکھتے ہیں:

''ہندوستان کے قدیم عہد میں اس ملک میں کول، سنتال، منڈا بھیل، گونڈ وغیرہ قومیں آباد تھیں، یہ لوگ تعمیر کے فن سے واقف تھے مگر دھات استعمال کرنا نہیں جانتے تھے۔ ہتھیار تراش کر بنائے تھے۔ ماہرین آثار قدیمہ کی

کوشش سے ۱۹۲۰ء میں سندھ کے ضلع لاڑکانہ میں ایک اونچے ٹیلے کے کھودنے سے اقوام متذکرہ کے صدر کا قدیم شہر موہنجوڈارو برآمد ہوا۔اس کی عمارتوں میں سے پتھر کے اوزار وغیرہ تھے، ڈاکٹر سر جان مارشل نے ان شہروں کے حالات بڑی تحقیق اور تفصیل سے لکھے ہیں۔ یہ لوگ مردوں کو جلاتے نہیں تھے، صندوقوں میں رکھ کر دفن کرتے تھے۔ان اقوام نے اپنے لیے کوئی قانون وضع نہیں کیا تھا۔اگر وضع کیا تھا تو وہ کونسا قانون تھا اس کی کیفیت تاریکی میں ہے۔''[۵۷]

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مورخین نے ہندو اقوام کی تاریخ کو گنجلک اور پیچیدہ بتایا ہے۔انھوں نے کسی بھی نتیجہ تک پہنچنے سے انکار کیا ہے۔اگر ہم بعض محققین کے احوال ہنود پر لکھی گئی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کی قدیم قوم یہ نہیں ہے جو بالائی سطروں میں ذکر کی گئی ہے۔آگے سید مفتی عبدالقیوم جالندھری قوم ہندو کے ہندوستان میں آمد کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''یہ قوم اس ملک کی قدیم قوم نہیں۔وسط ایشیا میں ایک بہت بڑی قوم تھی اس کے چند خانہ بدوش قبائل جھیل ارل کے قریب رہتے تھے، یہ لوگ تعمیر کے فن سے واقف نہ تھے۔کاشت کاری کی غرض سے اجتماعی زندگی بسر کرتے تھے جھیل ارل کے علاقے میں ایسی چراگاہیں نہ تھیں جو ان کے مویشیوں کے لیے کافی ہوں اس لیے یہ لوگ قریبا دو ہزار سال قبل مسیح پہاڑوں سے گزر کر سب سے پہلے سندھ میں داخل ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بابل کے علاقے میں بادشاہ نمرود کے دارالسلطنت شہر 'عور' سے حضرت ابرہیم آگ سے محفوظ رہ کر کنعان فلسطین اور مصر وحجاز کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔قوم ہندو سندھ کے بعد پنجاب آئی۔پنجاب کے بعد گنگا اور جمنا کے میدانوں میں جا کر آباد ہوگئی۔اس کے بعد بنگال گئی۔اس نے کول اور سنتھال وغیرہ قدیم اقوام مذکورہ سے مسلسل جنگ کر کے ان کو

پہاڑوں اور ملک کے اطراف میں جانے پر مجبور کر دیا۔ اب بھی ان قوموں کے بعض افراد آسام وغیرہ میں موجود ہیں۔''[۵۸]

اگر ہندو قوم کی ہندوستان میں آمد کے تعلق سے دیگر کتابوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اس طرح کی تاریخ بھی ملتی ہے۔ یہ بات تو طے ہے کہ ہندو قوم ہندوستان کی سب قدیم تہذیب والی قوم ہے۔ البتہ اس کی تاریخ وتہذیب بھی اسی وجہ سے واضح وشفاف نہیں ہے۔ دوسری بات یہ بھی پتہ چل گئی کہ اس قوم کی کوئی ایسی تہذیب کا ذکر کسی بھی مصنف نے نہیں کیا ہے کہ جس پر فخر کیا جا سکے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہندوستان کی قدیم قوم میں تہذیب وشائستگی کے نمونے ضرور پائے جاتے تھے۔

تعزیرات کا بیان

صاحب کتاب نے تحریر کیا ہے کہ:

''منو کے قانون میں بعض جرائم کی سزائیں وحشیانہ ہیں۔ بعض خفیف جرائم کی سزائیں سنگین ہیں۔ بعض سنگین جرائم کی خفیف سزائیں ہیں۔ قومی اور قبائلی تفریق کا اصول سزاؤں میں پوری طرح مدنظر رکھا گیا ہے۔ بعض سزائیں بجائے خود تضحیک کی موجب ہیں جیسے گدھے کے پیشاب سے بال منڈوانا وغیرہ۔ اس کے مقابل میں اسلامی قانون کی سزائیں عیوب و نقائص سے پاک ہیں۔''[۵۹]

ہندو دھرم میں سزا کے اقسام درج ذیل بتائے گئے ہیں۔

''عضو تناسل، شکم، زبان، دونوں ہاتھ، دونوں پاؤں، دونوں کان، دونوں آنکھیں، ناک، جائیداد، جسم، یہ دس ڈنڈ سزا کے مقام ہیں۔ جب کہ اسلامی قانون میں جسمانی سزاؤں کی چار قسمیں ہیں۔ قتل، صلیب، ہاتھ پاؤں مخالف طرفوں سے کاٹ دینا، قید وحراست اور جلاوطنی، نیز یہ سب سزائیں متبادل ہیں۔ ان میں بھی قاضی کو اختیار ہے کہ وہ مجرم اور جرم کے حالات وواقعات پر نظر کر کے ان چار سزاؤں میں سے جو سزا چاہے دے''۔[۶۰]

اسی طرح یہ بھی ملاحظہ کرتے چلیے کہ ہندو دھرم قتل کی سزا کے تعلق سے کیا کہتا ہے:

''برہمن مجرم قتل کی سزا سے مستثنیٰ ہے۔ اس کی موتراشی یا اسے ملک سے باہر نکال دینا کافی ہے۔ قتل کے مقام میں برہمن کو مونڈوانا ہی سزا ہے۔ اگر برہمن یا عالم شخص بہت گناہوں کا مجرم ہے تو بھی اسے قتل نہ کیا جائے، جسمانی سزا نہ دے کر اسے ملک سے باہر کر دیا جائے۔ دنیا میں برہمن کے قتل سے زیادہ کوئی گناہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے مسئلہ تعلیم کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس لیے راجہ برہمن کو قتل کرنے کا خیال بھی نہ لائے''[۶۱]

اس کے علاوہ اسلامی قانون کے ہر شعبہ میں عدل و مساوات نظر آتا ہے، قاتل خواہ کسی قوم یا خاندان کا ہو، یا کسی فرقہ یا منصب کا ہو سب کی سزا برابر ہے۔

''منوسمرتی میں سرقہ کی سزائیں پانچ قسم کی ہیں، پہلی دفعہ زبانی سزا دے یعنی تم نے اچھا کام نہیں کیا، پھر ایسا کام نہ کرنا، دوبارہ جھڑکنے اور لعنت کر کے اس کام سے ہٹائے۔ اگر سہ بارہ کرے تو جرمانے کی سزا دے۔ اگر اس پر نہ مانے تو قید اور جسم کے انگ کاٹنے کی سزا ہے۔ اس کا طریقہ یہ لکھا ہے کہ جس عضو سے دوسرے کی چیز چرائے اسی عضو کو قطع کرنا چاہیے تاکہ پھر ایسا کام نہ کرے۔ اگر جسم کا عضو کاٹنے سے مجرم جرم سے باز نہ آئے تو اس کو چار قسم کی وہ سزا دے جن کا تذکرہ بالائی سطروں میں آیا ہے۔ اسلامی قانون میں چوری کے عادی مجرم کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے''[۶۲]

مذکورہ اقتباسات اس بات پر بین ثبوت ہیں کہ ہندو دھرم میں تعزیرات کے حوالے سے کافی فرق مراتب پایا جاتا ہے۔ اس سے نوع انسانی میں تفریق و تقسیم اور بھید بھاؤ کا ثبوت ملتا ہے۔ ہندو دھرم میں تعزیرات اور قوانین کا تصور تو پایا جاتا ہے البتہ اس میں اونچ نیچ بہت ہے۔ جو کسی بھی مہذب معاشرے کی ترقی اور کامرانی کی زینت نہیں بن سکتا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ شعبۂ حیات کا کوئی گوشہ خالی نہیں ہے جہاں ہندوازم میں تفریق نہیں پائی جاتی ہو۔

سید مفتی عبدالقیوم جالندھری کی اس کتاب کی کئی اعتبار سے افادیت ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے

کہ اس موضوع پر میری نظر میں یہ واحد کتاب ہے جو اردو میں لکھی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ اس کتاب میں تعزیرات کے تمام شعبوں کا ذکر کر کے اور مذہب اسلام و ہندوازم کی معروف فقہی و قانونی کتاب 'منو دھرم شاشتر' سے موازنہ کر کے یہ ثابت کر دیا کہ اسلام کی تعلیمات ابدی اور عقل و عدل کے موافق ہیں۔ کیونکہ ان میں کسی بھی بنیاد پر اونچ نیچ کا تصور نہیں پایا جاتا ہے اور نہ ان بنیادوں پر قانون اسلام کے کسی بھی فیصلے کا نفاذ ہوتا ہے۔ البتہ ہندو دھرم میں ہے تو طبقاتی تقسیم کو امتیاز و تشخص کا نام دیا جاتا ہے۔

یہاں یہ بتانا مناسب ہے کہ تقابل ادیان پر کام کرنے کی بہت ساری وجوہات ہیں۔ من جملہ ان میں سے ایک یہ ہے کہ مسلم اسکالر یا دیگر دھرم سے وابستہ محققین نے ہندو دھرم اور دین اسلام کا تجزیاتی تقابل کیا ہے۔ چنانچہ مفتی عبدالقیوم جالندھری کی یہ کتاب بھی تقابلی مطالعہ کے لیے لکھی گئی ہے۔ یہ بات بھی قابل وضاحت ہے کہ اس طرح کی کتابوں کی ترویج و اشاعت دعوت و تبلیغ کا کام کرنے والوں کے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ ضمناً یہ بھی عرض کیا جا سکتا ہے کہ مفتی جالندھری کی یہ کتاب کسی بھی معاشرے میں سکون و اطمینان کا پیغام پہنچانے میں معین و مددگار ثابت ہوگی۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم برادران وطن کے دین اور ان کی تہذیب سے وابستگی اور واقفیت کی روایت کو مزید بڑھائیں تا کہ انسان یکجائیت اور مرکزیت کے ساتھ رہ سکے۔

ویدا اور اس کی قدامت

مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی (۱۸۷۵ء-۱۹۳۸ء) مستند مصنف، سوانح نگار اور معروف تاریخ نویس ہیں۔ انھوں نے کئی اہم کتابیں تدوین و ترتیب دی ہیں جو آج بھی ان کے علمی رتبہ پر بین ثبوت ہیں۔۔ ان کی کچھ تصانیف درج ذیل ہیں: تاریخ اسلام، تاریخ نجیب آباد، جنگ انگورہ، نواب امیر خان، گائے اور اس کی تاریخی عظمت، ویدا اور اس کی قدامت، ہندو اور مسلمانوں کا اتفاق اور آئینہ حقیقت نما وغیرہ وغیرہ۔ اس مضمون میں ان کی ایک اہم کتاب 'ویدا اور اس کی قدامت' پر گفتگو مقصود ہے۔ اس کتاب پر تحشیہ و اضافہ، مولانا سید حامد علی نے کیا ہے۔ آخر میں باقاعدہ ایک مقالہ کا بھی اضافہ ''ویدکیسے وجود میں آئے'' کیا ہے۔ کتاب کی طرح سید حامد علی کا حاشیہ بھی بیش قیمت اور علمی نکات سے مملو ہے۔ تحشیہ و اضافہ کی ترتیب کے بعد کتاب کی ضخامت ۹۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ مولانا اکبر شاہ خاں

نجیب آبادی نے اس کتاب کو ۱۹۲۵ء میں شائع کیا۔ اسی مطبوعہ نسخہ کو۔ مدنظر رکھ کر سید حامد علی نے اس پر تحشیہ واضافہ کیا ہے۔ کتاب کے پیش لفظ میں جو کہ سید علی نے ہی رقم کیا ہے۔ تحریر کرتے ہیں۔ ''ویداور اس کی قدامت'' کا ۱۹۲۵ء کا مطبوعہ نسخہ پیش نظر ہے، راقم الحروف نے نہ صرف یہ کہ طباعت کی غلطیاں درست کیں بلکہ کہیں کہیں ایک آدھ لفظ کے ردوبدل سے عبارت کا جھول بھی دور کیا ہے۔ کثرت سے توضیحی، تائیدی اور تصحیحی حواشی لکھے اور آخر میں ''وید کیسے وجود میں آیئے'' کے عنوان کے تحت ۲۵-۲۶ صفحات کے ایک مقالے کا اضافہ کیا۔ اس طرح کتاب کی ضخامت تقریباً چوگنی ہوگئی۔ افادیت میں جو اضافہ ہوا، اس کا اندازہ مطالعہ کے بعد ہو سکے گا، اللہ تعالیٰ اس حقیر کوشش کو قبول فرمائے اور مصنف اور مرتب کو اپنی مغفرت سے نوازے۔ آمین۔ اس وقت راقم کے سامنے جو نسخہ ہے وہ ۱۹۶۹ء کا مطبوعہ ہے۔ اس کی اشاعت۔ دفتر ادارہ شہادت حق ۲۵۰۳ بارہ دری شیر افگن، بلیماران دہلی سے ہوئی ہے۔

سبب تالیف

مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی نے سبب تالیف کے متعلق لکھا ہے:

''ہمارے ملک میں آریوں کے ایک نوعمر مذہبی فرقے نے اپنے آپ کو ویدوں کا صحیح اور حقیقی متبع ظاہر کر کے ویدوں کی قدامت اور ازلیت کا دعویٰ نہایت بلند آہنگی سے کیا اور گزشتہ صدی سے ہندوستان میں مذہبی مباحثوں اور مناظروں کا بازار گرم کر کے بسا اوقات ہندوستانی قوموں کے امن و سکون میں خلل ڈالا۔ ویدوں کی قدامت اور ازلیت کے ثابت یا رد کرنے کی کوشش میں آریوں، مسلمانوں اور عیسائیوں کی جانب سے بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، بہت سے مناظرے ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا، میرا خیال ہے کہ مذہبی تعصب اور بے جا طرف داری سے مجتنب رہ کر علمی اور تحقیقی رنگ میں اس موضوع پر ایک مضمون لکھنے کی گنجائش ابھی باقی ہے۔ ۱۹۱۶ء میں، میں نے قدامت وید کے دعاوی کی جانچ پڑتال کے لیے کچھ مواد فراہم کیا تھا، آج اسی کو مرتب کر کے اسے

رسالہ کی شکل میں پیش کرتا ہوں۔''[۶۳]

درج بالا اقتباس کی رو سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ زیر تبصرہ رسالہ آریہ سماج کی جانب سے کیے جانے والے ان اقدامات کا علمی جواب ہے جو انھوں نے اسلام کے حوالے سے کیے تھے۔ یہاں مولانا نے ایک بات بڑی قیمتی فرمائی ہے وہ یہ کہ اسلام پر ہونے والے اعتراضات کا رد سنجیدگی اور متانت سے دینے کے ساتھ ساتھ علمی طریقہ اپنانے کی ضرورت ہے۔ جذبات میں آکر بسا اوقات معاملہ الٹ جاتا ہے۔ اس لیے سنجیدہ اسوہ اور علمی دفاع سے ہی معترضین و معاندین کا دفاع کیا جاسکتا ہے۔ اسی طریقے کو تمام اہل علم نے پسند کیا ہے۔

مباحث کتاب

اس کتاب میں درج ذیل عناوین کے تحت انتہائی جامع اور علمی گفتگو کی گئی ہے۔

پیش لفظ (یہ اضافہ ہے سید حامد علی کا) تمہید، قدامت وید کے دعوے پر نظر، آریا لوگ ہندوستان کے قدیم باشندے نہیں ہیں، سنسکرت اور فارسی زبان کا تعلق، قدامت وید کے دعوے کا کوئی موید نہیں، وید اپنی نسبت کیا کہتے ہیں؟ کیا ویدوں کی تعلیم ہر زمانہ کے لیے دستور العمل بن سکتی ہیں، وید مجوسیوں کی تعلیمات سے ماخوذ ہیں۔ وید کیسے وجود میں آئے (اس مقالے کا اضافہ سید حامد علی نے کیا ہے۔)

یقیناً مباحث کتاب اس بات پر دال ہیں ہے کہ یہ کتاب علمی اور تحقیقی نہج پر مرتب کی گئی ہے۔

ہندوستان کے قدیم باشندے

یہ نکتہ بہت ہی اہم ہے، اس مسئلہ پر آئے دن بحث و مباحثہ ہوتا رہتا ہے کہ ہندوستان کے قدیم باشندے کون ہیں۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ آریہ ہندوستان کے قدیم باشندے ہیں۔ برعکس اس کے بعض دیگر باحثین نے اس بات سے انکار کیا ہے اور ہندوستان کے قدیم باشندے دراوڑی قوم کو بتایا ہے۔ مسلم مفکرین کے علاوہ خود ہندو مصنفین و مؤرخین نے بھی اس بات سے اتفاق نہیں کیا ہے کہ ہندوستان کے قدیم باشندے آریہ ہیں۔ جیسے ڈاکٹر رادھا کرشنن، نیز ڈاکٹر ڈبلیو ہنٹر کی تحقیق کے مطابق ہندوستان کے قدیم باشندے آریہ نہیں۔ چنانچہ اب ہم یہ جاننے کی سعی کریں گے کہ اس بابت مولانا

اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کی کیا رائے ہے بایں معنی وہ رقم کرتے ہیں۔

''دنیا بھر کے مورخین میں شاید اس سے بڑھ کر کوئی متواتر اور متفق علیہ مسئلہ نہیں ہے کہ کسی ابتدائی زمانہ میں ایک قوم وسط ایشیا اور دریائے جیحون کے کنارے رہتی تھی۔ اس قوم کا ایک حصہ مشرق کی جانب چلا آیا اور کوہ ہندوکش کی وادیوں کو طے کر کے ہندوستان میں داخل ہوا، یہاں کے باشندوں کو مفتوح اور مغلوب کر کے سکونت اختیار کی اور آریہ کے نام سے موسوم ہوا۔ سیامک، جس کو ایرانی اپنا ایک پیغمبر مانتے تھے اس کا دوسرا نام پارسا تھا، اس کے نام پر ایران کا نام پارس ہوا، سیامک کے بعد ہوشنگ کو پیغمبری ملی، ہوشنگ کا دوسرا نام ایران شاہ بھی تھا، لہٰذا فارس کا دوسرا نام ایران مشہور ہوا اور اس ملک کے رہنے والے ایرانی یا ایرین یا آریہ مشہور ہوئے۔ دوسری روایت لفظ آریہ کی تحقیق میں یہ ہے کہ فرایدون نے اپنے مقبوضہ ممالک کو تین حصوں میں تقسیم کر کے اپنے تینوں بیٹوں کو اس طرح سپرد کیا کہ شمال و مشرقی حصہ تورج کو دیا جہاں تورج اور اس کی اولاد عرصہ دراز تک حکمران رہی۔ اس ملک کا نام توران مشہور ہوا۔ مغربی حصہ سلم کو دیا اور درمیانی حصہ جو سب سے زیادہ بہتر اور متبرک حصہ ملک سمجھا جاتا تھا، سب سے چھوٹے بیٹے ایرج کو دیا، ایرج کے نام سے ایران مشہور ہوا، اور اس ملک کے رہنے والے ایرانی ایرین یا آریہ کہلائے۔ تیسری روایت یہ ہے کہ آریا مصدر آر سے نکلا ہے جس کے معنی قدیم سنسکرت زبان میں (ہنٹر اور میکس مولر کے قول کے مطابق) کاشتکاری اور زمین پھاڑنے کے ہیں لہٰذا آریہ کے معنی کاشت کار کے ہوئے۔

آر چمڑا سینے کے اوزار اور بیل ہانکنے کے ڈنڈے کو بھی کہتے ہیں جس کے معنی سرے پر نوکدار کیل لگی ہوتی ہے لہٰذا آریا کے معنی ہوئے چمڑا سینے اور بیل ہانکنے والا ہوئے۔''[۶۴]

متذکرہ بالا شواہد اس بات کی ببانگِ دہل شہادت دے رہے ہیں کہ ہندوستان کے قدیم باشندے آریہ نہیں ہیں۔ فاضل مصنف نے اپنے اس دعویٰ کی تائید میں مشہور مورخ اور ہندوستان کے گزیٹر مرتب کرنے والے ڈاکٹر ڈبلیو ہنٹر کی کتاب 'تاریخ اہل ہند' سے ایک اقتباس نقل کیا ہے۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر ہنٹر کو خود آریہ سماجی بھی مستند مورخ تسلیم کرتے ہیں:

> ''نہایت قدیم زمانے میں ایک اعلیٰ درجہ کی قوم شمال و مغرب کی جانب سے اصلی باشندوں کو زک دیکر ہندوستان میں داخل ہونا شروع ہوئی، یہ قوم آریہ نسل سے تھی، برہمن، راجپوت اور انگریز اسی (آریا قوم) کی اولاد ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اصل میں وسط ایشیاء سے آئی تھی اور اسی مرکز، (وسط ایشیاء) سے چند شاخیں مشرق اور چند مغرب کو روانہ ہوئیں۔ آریانسل کی شاخیں وسط ایشیا کے اصلی مرکز سے، جو ان کا قدیمی گھر تھا، مشرق کی جانب گئیں اور ان کے زبردست گروہ ہمالیہ کے دروں میں ہوکر پنجاب میں داخل ہوئے اور تمام ہند میں بالخصوص برہمن اور راجپوت کے نام سے پھیل گئے۔ آریا قوم مشرقی نیز مغربی شاخ نے اصل باشندوں کو جو اس سرزمین پر قابض تھے، ماتحت کرلیا اور ہر طرح پر اپنی فضیلت ان پر قائم کی۔''[۶۵]

تصور کیجیے ان حقائق و شواہد کے بعد کوئی یہ دعویٰ یقین سے کرسکتا ہے کہ ہندوستان کے قدیم باشندے آریا ہیں۔ مورخین نے ایک نہیں بلکہ سیکڑوں دلائل پیش کیے اور بتایا ہے کہ آریوں کی آمد سے قبل ہندوستان میں ایک اور قوم آباد و سکونت پذیر تھی۔

ویدوں کی تعلیمات آفاقی ہیں؟

مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی نے اپنی اس کتاب میں ایک انتہائی اہم مسئلہ اٹھایا ہے کہ کیا ویدوں کی تعلیمات ہر دور اور زمانہ کے لیے لائق اتباع اور دستور العمل ہیں۔ اس بابت بہت سے ہندوؤں خصوصا آریہ سماجیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ وید ہر زمانے کے لیے آفاقی اور قابل عمل ہیں۔ اس کے

متعلق مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کی تحقیق ہندوؤں کے اس دعویٰ کا بطلان کرتی ہے۔ انھوں نے خود علماء ہنود کی آراء سے اس بات کو ثابت کیا ہے ویدوں کی تعلیمات وارشادات آفاقی نہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''اب اس بات کی تحقیق مقصود ہے کہ ویدوں میں ایسی تعلیم موجود ہے یا نہیں، جو ہر زمانے کے لیے انسانی زندگی کا دستور العمل بن سکے۔ مذہب کی اصل غرض اور اس کا انتہائی بااثر جو دنیا میں مشہور ومحسوس ہوسکتا ہے وہ تہذیب نفس اور تربیت اخلاق ہے، وہ کتاب جو انسانی زندگی کے لیے دستور العمل ہو، اس میں خدا شناسی، عبادات، معاملات، معاشرت اور تمدن کے اعلیٰ اور پختہ اصول ہونے چاہیے لیکن ویدوں کے ٹٹولنے سے اس قسم کے قوانین جو اس زمانے میں کسی معمولی انسان کی تسکین خاطر کو موجب ہو سکیں دستیاب نہیں ہوتے۔''[۶۶]

سید حامد علی نے اس کے ذیل میں جو حاشیہ درج کیا ہے وہ بھی انتہائی اہم ہے۔ انھوں نے ہندومت کے مشہور مفکر ومحقق رادھا کرشنن کی کتاب Religion and Society کے حوالے سے لکھا ہے:

''ویدوں میں دھرم کی منضبط تفصیلات نہیں ہیں، وہ آئیڈیل چیزوں کی طرف اشارہ کرتے اور کچھ اعمال کی نشاندھی کرتے ہیں، ضوابط واحکام سمرتیوں اور دھرم شاستروں میں جو عملا مترادف ہی پائے جاتے ہیں، سمرتیوں ان یادداشتوں کا لفظ بہ لفظ حوالہ دیتی ہیں جو وید کے ماہر علماء سے محفوظ کی گئی ہیں، سمرتی کا وہ ضابطہ، جس کا ماخذ وید میں مل سکتا ہو، اسے وید کی اتھارٹی حاصل ہوجاتی ہے۔''[۶۷]

اب یہ بات پورے اعتماد سے کہی جاسکتی ہے کہ ویدوں کی تعلیمات میں عالمگیریت اور آفاقیت کا کوئی بھی عنصر نہیں پایا جاتا ہے۔ اس بات کا اعتراف واقرار خود علماء ہنود نے کیا ہے۔ جیسا کہ ہم نے رادھا کرشنن کے نظریہ کو سمجھا۔

ویدوں کے ماخذ

مولانا نے اپنی اس کتاب میں ایک بحث یہ اٹھائی ہے کہ وید مجوسیوں کی تعلیمات سے ماخوذ و مشتق ہیں۔انھوں نے لکھا ہے:

''قدیم ایرانیوں اور زندواوستا کے مذہب میں سورج کی بڑی تعظیم ہے۔اسی طرح رگ وید کے متعدد مقامات میں سورج بطور دیوتا مانا گیا ہے۔''[۶۸]

اسی طرح انھوں نے اس بات سے بھی استدلال کیا ہے:

''کوی جس کے معنی سنسکرت زبان میں شاعر کے ہوگئے ہیں، ویدوں میں کاہنوں، غیب دانوں اور داناؤں پر بولا گیا ہے۔ایرانیوں میں بھی اس لفظ کا ایسا ہی استعمال ہوتا تھا اور یہ ان کے مشہور بزرگوں کا خطاب ہوتا تھا۔''[۶۹]

یہ ملاحظہ کیجیے آگ (اگنی) پرستش و تعظیم اور اس کو بطور معبود ماننا دونوں جگہ یکساں پایا جاتا ہے۔

''قربانیوں کے طریقے اور عبادت کے وقت کی دعائیں ویدوں اور پارسیوں کی کتابوں میں اس قدر مشابہ اور اس کثرت سے ہیں کہ اگر سب کو اس جگہ نقل کیا جائے تو یہ ایک دفتر بن جائے۔پرستش کے متعلق مجوسیوں کی کتاب میں درج ہے، میں متر بزرگ کو اپنی طاقت یعنی ہوم کے آلات اور منتروں کے زور سے ایرانیوں کی خوبیٔ قسمت اور بہتری کے واسطے سراہتا ہوں، وہ متر میری مدد کرے، وہ متر ہمیں کشایش دے، وہ متر ہمارے دلوں کو مسرت بخشے، وہ متر ہمیں بہت سی بخششیں دے، وہ متر ہمیں تندرستی دے، وہ متر ہم کو ہمارے دشمنوں پر فتح دے''۔[۷۰]

یہی مفہوم رگ وید میں بھی آیا ہے:

''میں پاک طاقت والے متر اور دشمنوں کا ناش کرنے والے ورن کو جو دونوں مل کر مینھ برساتے ہیں، بلاتا ہوں، اے عقیل متر اور ورن، تم دونوں

ہمارے یگ کو زیادہ کرو، تم بہت آدمیوں کے فائدے کے واسطے پیدا ہوئے ہو، بہت لوگوں کو تمہارا آسرا ہے''۔ [۱]

ان شواہد کی روشنی میں مصنف کا تجزیہ یہ ہے کہ ویدوں کی تعلیمات مجوسیوں کی دینی کتب ژند اور آوستا جیسی کتب سے اخذ کی گئی ہیں۔ لہٰذا وید کی قدامت اور ان کا کلام الٰہی ہونا دونوں دعوے آریہ سماجیوں کے دلائل کی رو سے خارج ہوتے ہیں۔

وید کیسے وجود میں آئے؟

اس عنوان کے تحت ایک مقالے کا اضافہ سید حامد علی نے کیا ہے۔ انھوں نے اس موضوع پر نہایت تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اہم بات اس مقالے میں یہ ہے کہ مقالہ نگار نے ہندو علماء اور مفکرین کی کتب سے حوالے دیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''وید کیسے وجود میں آئے؟ کون شخص یا کون لوگ اس کے مصنف ہیں؟ اس کا صحیح اور قطعی جواب دینا آج دشوار بلکہ ناممکن ہے''۔ [۲]

بالائی سطروں سے اس بات کا یقین ہو گیا کہ خود علماء ہنود میں اس حوالے سے متضاد آراء پائی جاتی ہیں۔ یہاں ان میں سے چند آراء نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ سید حامد علی نے ویدانت درشن کے ادھیائے ۱-۳ کے ۲۰-۳۹ سوتروں کے حوالے سے لکھا ہے:

''ایشور نے دنیا کے آغاز میں (اپنے) ازلی وابدی کلام (وید) کو اس لیے ظاہر کیا کہ اس سے دنیا کے معاملات نہایت خوش اسلوبی سے پورے ہوسکیں اور تمام موجودات کے نام مع ان کی ذات وصفات کے سب وید سے مقرر کیے۔ اور ایک قوم کے ذاتی اعمال مع ان کے خانگی معاملات اور اسماء کے سب کا اظہار وید سے کیا، اور جن لوگوں نے پہلی دنیا میں جو کام کیے تھے، اس مرتبہ بھی انھوں نے انہیں کاموں کو پسند کیا اور جس کو پہلی دنیا میں جو جو عادات پڑ چکی تھیں، چاہے وہ اچھی تھیں یا بری، انھوں نے دوبارہ پیدا ہو کر بھی اپنی انہی سابقہ عادات کو اختیار کیا اور ہر ایک رشی کا کام مع ان

کے ناموں کے ایشور نے قیامت کبریٰ کے بعد ہی ویدوں سے مقرر
کر دیے تھے''۔[۳۷]

اس اقتباس کے ضمن میں سید حامد علی نے لکھا ہے کہ معلوم ہوا کہ وید خدائے لایزال ولم یزل کا ازلی وابدی کلام ہے جسے وہ کائنات کے آغاز کے وقت معاملات میں اہل دنیا کی رہنمائی کے لیے نازل فرماتا ہے۔ االبتہ یہ کہنا درست ہوگا کہ ویدوں کے کلام الٰہی ہونے میں شک خود ہندو علماء کو ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی معروف کتاب 'ڈسکوری آف انڈیا' میں ویدوں کو انسانی ذہن کی تخلیق وتصنیع سے تعبیر کیا ہے۔ اسی طرح مولانا ابوالوفا ثناءاللہ امرتسری نے باقاعدہ 'حدوث وید' لکھ کر ویدوں کی اندرونی شہادتوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ وید نہ ہی قدیم ہیں اور نہ ہیں یہ کلام خداوندی ہیں۔

کتاب کی اہمیت

مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کی اس کتاب کی پہلی خوبی یہ ہے کہ اس کے اندر ویدوں کے متعلق تمام بنیادی نکات کو شامل کیا گیا ہے۔ کتاب کی ہر بحث اور نکتہ علم وتحقیق کے زیور سے مزین ہے۔ مزید برآں سید حامد علی کے حاشیہ نے کتاب کی اہمیت اہل علم کی نظر میں بڑھا دی ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی نے جن مسائل ومباحث پر گفتگو کی ہے ان کے تمام نکات کو انتہائی سلیس اور سادہ زبان میں سمجھانے کی کاوش کی ہے۔ گویا اگر کسی کو ہندوؤں کے دینی مصادر ویدوں کو سمجھنا ہو تو ایسے تشنگان علوم کے لیے یہ کتاب بہت حد تک اس کی تشنگی بجھانے کا کام کرے گی۔ آخر میں یہ عرض کر دوں کہ ہندومت میں ویدان کے بنیادی مصادر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ البتہ ان کے الہامی ہونے میں اہل علم ہندو مفکرین نے کسی بھی طرح کی وضاحت نہیں کی ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہ ان کا مقدس سرمایہ ہے۔ ضمنا یہ عرض کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا کہ دور جدید کے کئی مصنّفین جنھوں نے تقابل ادیان پر کام کیا ہے۔ وہ بھی کسی حد تک ویدوں کے الہامی ہونے کے قائل ہیں۔ اس بابت راقم کی رائے یہ ہے کہ یہ انتہائی قدیم کتابیں ہیں۔ مجدد سیرت ڈاکٹر حمید اللہ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ قرآن کریم کی آیت زبر الاولین سے مراد یہی وید ہیں۔

حواشی

۱۔ دیکھئے تفصیل مروج الذہب کا اردو ترجمہ، صفحہ ۲۹-۳۱
۲۔ مروج الذہب کا اردو ترجمہ، صفحہ ۲۷
۳۔ مروج الذہب کا اردو ترجمہ، صفحہ ۹۲-۹۳
۴۔ مروج الذہب کا اردو ترجمہ، صفحہ ۹۴-۹۵
۵۔ مروج الذہب کا اردو ترجمہ، صفحہ ۹۳-۹۴
۶۔ ایضاً، ص:۹۹
۷۔ مروج الذہب کا اردو ترجمہ، صفحہ ۱۰
۸۔ خواجہ حسن نظامی، کرشن بیتی، شائخ بک ڈپو، ۱۹۲۳ء، ص:۱۱-۱۲
۹۔ ایضاً، ص:۱۲
۱۰۔ خواجہ حسن نظامی، کرشن بیتی، شائخ بک ڈپو، ۱۹۲۳ء، ص:۱۳-۱۴
۱۱۔ ایضاً، ص:۱۴
۱۲۔ خواجہ حسن نظامی، کرشن بیتی، شائخ بک ڈپو، ۱۹۲۳ء، ص:۱۶-۱۷
۱۳۔ خواجہ حسن نظامی، کرشن بیتی، شائخ بک ڈپو، ۱۹۲۳ء، ص:۲۰-۲۱
۱۴۔ خواجہ حسن نظامی، کرشن بیتی، شائخ بک ڈپو، ۱۹۲۳ء، ص:۲
۱۵۔ ایضاً، ص:۳
۱۶۔ دیکھیے تفصیل، خواجہ حسن نظامی، کرشن بیتی، ص:۶-۱۰
۱۷۔ خواجہ حسن نظامی، ہندو مذہب کی معلومات، شائخ بک ڈپو، ۱۹۲۷ء، ص:۴۰
۱۸۔ تفصیل کے لیے دیکھیے خواجہ حسن نظامی، ہندو مذہب کی معلومات، ص:۲-۶
۱۹۔ خواجہ حسن نظامی، ہندو مذہب کی معلومات، ص:۲۱-۲۲
۲۰۔ ایضاً، ص:۲۲
۲۱۔ دیکھیے تفصیل، ہندو مذہب کی معلومات، ص:۲۹-۳۱
۲۲۔ ایضاً، ص:۳۱-۳۲
۲۳۔ دیکھیے تفصیل، ہندو مذہب کی معلومات، ص:۳۲
۲۴۔ ایضاً، ص:۳۲-۳۳
۲۵۔ دیکھیے تفصیل، ہندو مذہب کی معلومات، ص:۲
۲۶۔ عبیداللہ نومسلم، (مولانا) تحفۃ الہند مع تکملہ رسالہ کتھا سلائی، دار احیاء السنہ اردو بازار، لاہور، ص:۴

۲۷۔ عبیداللہ نومسلم، (مولانا) تحفۃ الہند مع تکملہ رسالہ کتھا سلائی، ص:۴-۶
۲۸۔ ایضاً، ص:۸-۹
۲۹۔ تحفۃ الھند، ص۱۵-۱۶
۳۰۔ تحفۃ الہند، ص:۲۳
۳۱۔ ایضاً، ص:۲۳
۳۲۔ تحفۃ الہند، ص:۲۴
۳۳۔ ایضاً، ص:۲۷
۳۴۔ مرزا محمد کاظم برلاس مرادآبادی، تاریخ الہند، گلزار احمدی، ج۳، ص:۳۶۹
۳۵۔ مرزا محمد کاظم برلاس مرادآبادی، تاریخ الہند، گلزار احمدی، ج۳، ص:۳۷۰-۳۷۱
۳۶۔ ایضاً، ص:۳۷۲
۳۷۔ مرزا محمد کاظم برلاس مرادآبادی، تاریخ الہند، گلزار احمدی، ج۳، ص:۳۷۱
۳۸۔ مرزا محمد کاظم برلاس مرادآبادی، تاریخ الہند، گلزار احمدی، ج۳، ص:۴۲۸-۴۲۹
۳۹۔ ایضاً، ص:۴۳۱
۴۰۔ ایضاً، ص:۴۴۶
۴۱۔ مرزا محمد کاظم برلاس مرادآبادی، تاریخ الہند، گلزار احمدی، ج۳، ص:۴۸۶-۴۸۷
۴۲۔ ایضاً، ص:۵۴۸-۵۴۹
۴۳۔ ہندو اخلاقیات، ص:۸
۴۴۔ ایضاً، ص:۸
۴۵۔ ہندو اخلاقیات، ص:۹
۴۶۔ ایضاً، ص:۱۳
۴۷۔ ہندو اخلاقیات، ص:۱۳
۴۸۔ ایضاً، ص:۱۳
۴۹۔ ایضاً، ص:۱۵
۵۰۔ ہندو اخلاقیات، ص:۲۴
۵۱۔ ایضاً، ص:۲۴
۵۲۔ ہندو اخلاقیات، ص:۵۰-۵۱
۵۴۔ ایضاً، ص:۵۲
۵۴۔ ہندو اخلاقیات، ص:۸۶
۵۵۔ ایضاً، ص:۸۶

۵۶۔ جالندھری، سید عبدالقیوم، (مفتی) منو کا قانون اور اسلامی قانون، سید محبوب عالم لٹن روڈ لاہور، بدون تاریخ، دیکھیے دیباچہ

۵۷۔ جالندھری، سید عبدالقیوم، (مفتی) منو کا قانون اور اسلامی قانون، ص:۸-۹

۵۸۔ ایضاً، ص:۱۰-۱۱

۵۹۔ جالندھری، سید عبدالقیوم، (مفتی) منو کا قانون اور اسلامی قانون، ص:۴۲

۶۰۔ ایضاً

۶۱۔ جالندھری، سید عبدالقیوم، (مفتی) منو کا قانون اور اسلامی قانون، ص:۴۶

۶۲۔ ایضاً، ص:۴۹

۶۳۔ نجیب آبادی، اکبر شاہ خاں (مولانا)، ویدا اور اس کی قدامت، ادارہ شہادت حق، بلیماران، دہلی، ۱۹۶۹ء، ص:۶

۶۴۔ نجیب آبادی، اکبر شاہ خاں (مولانا)، ویدا اور اس کی قدامت، ص:۹-۱۰

۶۵۔ نجیب آبادی، اکبر شاہ خاں (مولانا)، ویدا اور اس کی قدامت، ص:۱۰-۱۱

۶۶۔ نجیب آبادی، اکبر شاہ خاں (مولانا)، ویدا اور اس کی قدامت، ص:۴۳

۶۷۔ ایضاً، ص:۴۳

۶۸۔ نجیب آبادی، اکبر شاہ خاں (مولانا)، ویدا اور اس کی قدامت، ص:۹-۱۰

۶۹۔ ایضاً، ص:۶۷

۷۰۔ ایضاً، ص:۶۷-۶۸

۷۱۔ نجیب آبادی، اکبر شاہ خاں (مولانا)، ویدا اور اس کی قدامت، ص:۶۸

۷۲۔ ایضاً، ص:۶۹-۷۰

۷۳۔ نجیب آبادی، اکبر شاہ خاں (مولانا)، ویدا اور اس کی قدامت، ص:۶۹-۷۰

(جاری)

عمار عبدالحئی *

مناظر احسن گیلانی اور ان کے تعلیمی نظریات

سید مناظر احسن گیلانی کے مورث اعلیٰ سید احمد جاجنیری ہیں جو مدینہ منورہ کے قریب مقام واسط کے رہنے والے تھے۔ حالات کے جبر نے انہیں وہاں سے عراق پہنچا دیا اور بغداد کے ایک محلّہ جاجنیر میں سکونت پزیر ہو گئے۔ ۵۸۸ھ کے اوائل میں سلطان شہاب الدین کی جنگ مہاراجہ رائے پتھوڑا سے ہوئی۔ سلطان نے اپنی فتح یابی کے لیے دیگر سادات قوم کے ساتھ سید احمد جاجنیری تک بھی رسائی حاصل کی۔ یہ حضرات بغرض جہاد ہندوستان تشریف لائے اور سلطان کو فتح نصیب ہوئی۔[1]

پھر سلطان نے شکرانہ کے طور پر دیگر غازیوں کی طرح آپ کو بھی ضلع مونگیر (بہار) کا ایک بڑا حصہ (بارہ گاواں) جاگیر میں عطا کیا۔ اسی علاقہ کا ایک گاؤں گیلانی تھا۔ چنانچہ مفتی ظفیر الدین صاحب علامہ گیلانی ہی کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں:

> ''مصنف تاریخ بارہ گاواں ومضافات نے لکھا ہے کہ سید احمد جاجنیری کے خاندان کے جو افراد گیلانی آئے ان کی رشتہ داری مندرجہ ذیل حضرات سے قائم ہوئی۔ شفاعت علی ساکن مانے چواڑہ اور شجاعت علی گیلانی۔''[2]

یہی آخر الذکر آپ کے پردادا ہیں جو ایک صاحبِ علم وعمل بزرگ تھے۔ ان کے بیٹے سید محمد

* گیسٹ ٹیچر، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، ای میل: ammarjmi18@gmail.com

احسن ممتاز عالم دین اور مشہور صاحب درس و تدریس تھے۔ شادی کے بعد تحصیل علم کا شوق پیدا ہوا، اچانک گھر سے نکل پڑے، لکھنؤ، رامپور، اور دہلی کے نامور اساتذہ کے زیر سایہ مسلسل چودہ سال رہ کر اپنی علمی تشنگی بجھائی اور درجہ کمال حاصل کیا۔ پھر گھر لوٹے اور اپنے وطن ہی میں ایک دارالعلوم کی داغ بیل ڈالی اور تشنگان علوم نبویہ کو خوب خوب سیراب کیا، اس بات کی شہادت خود مولانا گیلانی کی شاہکار کتاب ہندوستان میں نظام تعلیم وتربیت سے ملتی ہے کہ جب (دادا محترم کو) کامل اطمینان ہو گیا تب گھر لوٹے اور بجائے علم فروشی کے علم پاشی اور معارف بخشی میں ساری زندگی گزار دی۔[۳]

مولانا سید محمد احسن (وفات ۱۳۰۱ھ) مولانا گیلانی کے دادا محترم تھے۔ ان کے تین صاحبزادے تھے اور تین ہی صاحبزادیاں بھی، سب سے بڑے ابوظفر محمد سلیمان تھے۔ جوانی ہی میں فوت ہو گئے، دوسرے ابونصر حافظ قرآن اور ذی استعداد عالم تھے، ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اور سب سے چھوٹے مولانا گیلانی مرحوم کے والد حافظ ابوالخیر صاحب تھے۔ حفظ قرآن کے بعد فارسی کی تکمیل کی۔ ۱۴ سال کی عمر ہی میں سر سے والد کا سایہ اٹھ جانے کی وجہ سے تعلیمی سلسلہ آگے نہیں بڑھ سکا۔ بالآخر کاروبار میں مشغول ہو کر رہ گئے۔ ان کی سادگی، اور فیاضی علاقہ بھر میں مشہور تھی۔ ۱۹۲۹ء میں ان کی وفات ہوئی۔ مرحوم نے تین لڑکے اور تین لڑکیاں چھوڑیں، مناظر احسن، مکارم احسن، مظہر احسن۔ موخرالذکر کو مولانا گیلانی اپنے ہمراہ حیدرآباد لے گئے، وہاں انہوں نے اپنے بڑے بھائی (مولانا گیلانی) کے زیر سایہ اعلیٰ تعلیم پائی اور مولانا مرحوم ہی کی کوشش سے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے شعبہ معاشیات میں ریڈر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو گیا لیکن افسوس! کہ تقدیر کو منظور نہ تھا کہ یہ علمی سلسلہ زیادہ دنوں جاری رہے۔ چنانچہ وقت موعود آپہونچا اور انہوں نے ۵ ستمبر ۱۹۷۱ء کو جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔[۴] اور مکارم احسن صاحب نے بھی متوسط تعلیم حاصل کر لینے کے بعد ۱۹۲۵ء میں بسلسلہ ملازمت حیدرآباد کا سفر کیا، معاش کی تلاش میں تھے، ایک جگہ سے ملازمت کا پروانہ بھی مل گیا لیکن اس سلسلے کی کسی بھی ذمہ داری کو قبول کرنے سے پہلے ہی اپنے وطن واپس آ گئے اور زندگی بھر کاروبار میں ہی مشغول رہے۔ مولانا گیلانی کے گھر والوں کی پوری ذمہ داری بھی انہیں کے سپرد رہی، اخیر دم تک انتہائی خندہ پیشانی کے ساتھ اس کو نبھاتے رہے اور محبت وسخاوت اور بے نفسی و بے ریائی کا یہ خاکی پتلہ جنوری ۱۹۸۱ء میں داعی اجل کو لبیک کہہ گیا۔[۵]

مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنی ننھیال موضع استھانواں ضلع پٹنہ میں ۹ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ مطابق یکم اکتوبر ۱۸۹۲ء کو اس گہوارہ ہستی میں آنکھیں کھولیں، نشونما کا بڑا حصہ دادھیال گیلانی میں گزارا، خاندان کی دینی، اخلاقی اور تعلیمی روایات ان کے حصہ میں آئی۔ مولانا کی پرورش و پرداخت کے اولین تین ستون ہیں: عم محترم حکیم مولانا سید ابونصر صاحب، والد بزرگوار اور عظیم سرمایہ حیات والدہ ماجدہ جو ایک اونچے خاندان کی پاکباز، دیندار اور سراپا اخلاص خاتون تھیں۔ مولانا گیلانی کی زندگی کے طویل سفر کا سنگ میل یہی تین تھے، انہیں کی تمناؤں، خلوص، جزبہ دروں اور عائے سحر گاہی کا مولانا کو ثمرہ کہا جاسکتا ہے بلکہ آپ اپنے عظیم دادا کے حسین خواب کی زندہ تعبیر تھے۔[۶]

گھر کا ماحول دیندارانہ و مولویانہ تھا اور کئی پشتوں سے یہ سلسلہ چلا آ رہا تھا۔ چونکہ مولانا کے چچا مولانا ابونصر صاحب کے کوئی اولاد نہ تھی اس لیے ان کی تمام تر توجہات آپ کی تعلیم و تربیت ہی کی طرف مرکوز رہی، چنانچہ مولانا گیلانی کی بسم اللہ تقریباً تین سال کی عمر میں ہوئی اور ابھی صحیح سے الفاظ و حروف کی شناخت بھی نہ ہوسکی تھی کہ سینکڑوں فارسی کے الفاظ ان کو ازبر ہو گئے تھے۔ جس کی تصویر خود انہیں کی تحریر میں اس طرح دیکھی جاسکتی ہے:

> ''خاکسار کا خاندان چند پشتوں سے مولویوں کا خاندان ہے۔ والد مرحوم تو نہیں لیکن میرے عم مغفور مولانا حکیم حافظ سید ابونصر گیلانی درس نظامیہ کے عالم تھے۔ انہیں کی آغوشِ تربیت میں آنکھیں کھولیں، چوں کہ خود ان کی کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے بجائے بیٹے کے مجھے مانتے اور چاہتے تھے۔ تین ہی سال میں جب الفاظ کے تلفظ پر زبان ایک گونہ قادر ہو چکی تھی، سینکڑوں فارسی کے الفاظ مجھے یاد کرادئے تھے۔''[۷]

پھر آپ کے مکتبی دور کی ابتداء باضابطہ پانچ سال کی عمر سے ہوئی، قدرت کا فیصلہ بھی بڑا عجیب وغریب اور حیرت انگیز ہوتا ہے کہ لوگ انگشت بدنداں ہو کر رہ جاتے ہیں، اور ہزار رفقاء کی ناخوش گواریوں اور خوش زمانہ کے مخالف ہونے کے باوجود خدا انسانی کشتی کو ہر طرح کی تعلیمی، فکری اور ذہنی ہچکولوں سے محفوظ کر کے ایسی راہیں ہموار کر دیتا ہے کہ طبع کو سلامتی، فکر کو ایک جہت اور کارواں کو اپنی منزل کا پتہ مل جاتا ہے۔

انیسویں صدی اپنی عمر کے آخری پڑاو پر ہے، ہر طرف انگریزی تعلیم کا چرچا ہے، خود، گیلانی میں آپ کے دادا کے بعد چچا مرحوم کے علاوہ کوئی عالم نہیں ہے اور نہ ہی لوگوں کی نگاہوں میں علماء کی کوئی قدر و منزلت ہے، ایسے ناگفتہ بہ حالات میں علم دین کے شوق کو کرامت ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، چنانچہ مولانا کے چچا مرحوم نے پورے اطمینان قلب، کامل یقین اور بہت ساری نیک تمناوں کے ساتھ اپنے پیارے بھتیجے کے تابناک مستقبل کے پیشِ نظر دینی تعلیم کا فیصلہ کیا۔ مولانا مرحوم نے اپنی تعلیم کا ابتدائی سفر قرآن، اردو فارسی اور عربی وصرف نحو کی کتابیں، اپنے وطن گیلانی میں ہی مکمل کیا۔ جس کا وافر حصہ مولانا ابونصر صاحب ہی نے پڑھایا۔

جب ابتدائی تعلیم کا مرحلہ طے ہو گیا تو اہل خانہ مولانا کو اعلیٰ تعلیم دلانے کے سلسلے میں فکر مند ہوئے۔ تعلیم وتربیت میں خاص نکھار پیدا کرنے کی خاطر ایسے گہوارہ علم وفن کی جستجو ہوئی جو ان کے مناسب ہو۔ اس لیے عم محترم کی نگاہ مولانا سید برکات احمد ٹونکی پر گئی جو مولانا مناظر احسن گیلانی کے دادا کے خاص شاگرد حکیم مولانا دائم علی مونگیری ٹونکی کے صاحبزادے تھے۔ اسی رشتہ علمی کی بنا پر چچا نے مولانا کو ۱۳۲۴ھ میں مولانا سید برکات احمد کے ذمہ سونپ دیا اور مولانا اپنے وطن سے ہزاروں میل دور ریگستانوں کے شہر ٹونک پہنچ گئے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی نے مدرسہ خلیلیہ ٹونک میں ۱۳۲۴ھ سے ۱۳۳۱ھ تک مسلسل سات سال رہ کر مختلف علوم وفنون منطق، فقہ، ادب، ہیت اور ریاضی کی کتابیں پڑھیں۔ معقولات کے علاوہ دیگر کتابیں مولانا محمد اشرف صاحب ملتانی سے بھی پڑھیں۔[۸]

چونکہ مولانا موصوف کو مولانا برکات احمد صاحب کے ذمہ سپرد کیا گیا تھا جو اس دور میں معقولات کے ملکی شہرت یافتہ عالم تھے اور خیرآباد کی قدیم روایات کے سچے وارث وامین تھے۔ علم بڑا پختہ اور ٹھوس تھا اس لیے یہاں کی سات سالہ علمی زندگی میں مولانا پر دیگر علوم کا رنگ ہلکا اور معقولات کا گاڑھا تھا، چناں چہ اپنی آپ بیتی میں خود فرماتے ہیں:

> ''علوم عربیہ کا ذوق گو ہمارے خاندان کا موروثی ترکہ تھا، لیکن اس ذوق پر معقولیت کا رنگ چونکہ مستولی تھا اس لیے ہمارے مرحوم عم محترم مولانا الحاج حکیم سید ابونصر جن سے عربی کی ابتدائی تعلیم فقیر حاصل کر رہا تھا، انہوں نے

> آیندہ تعلیمی مراحل کی تکمیل کے لیے مجھے ریاست ٹونک پہونچا دیا جہا
> ں خیرآباد کے معقولی اسکول کے امام مولانا سید برکات احمد صاحب اپنے
> درس کی مسند بچھائے ہوئے زیادہ تر عقلی علوم (منطق وفلسفہ) کی تدریس و
> تعلیم میں بصد ذوق وشوق مشغول ومنہمک تھے۔[9]

مدرسہ خلیلیہ ٹونک میں فلسفہ وحکمت کی تعلیم حاصل کر چکے تو فطرت کے فیصلہ نے زہری زمانہ، بوحنیفہ وقت، عارف باللہ مولانا محمود حسن کی خدمت میں پہنچا دیا جو عالمی شہرت یافتہ گہوارہ علم و عرفاں اور ایشیا کی عظیم دینی درس گاہ دارالعلوم دیوبند کی مسند صدارت اور شیخ الحدیث کے منصب پر جلوہ افروز تھے۔ چوں کہ مولانا سید برکات احمد صاحب کی توجہ خاص نے مولانا کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کر کے بڑی حد تک سجا سنوار دیا تھا، پھر حضرت شیخ الہند کے فیضان تعلیم وتربیت نے سونے پر سہاگا کا کام کیا اسی دوہری تربیت نے خیالات کی بے راہ روی کو سلامتی سے اور مضطرب دل کو اطمنان سے بدل کر فکر وعقیدہ اسلامی اور حسن اخلاق وکردار کا مہکتا ہوا ایک خوبصورت گلدستہ بنا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا مرحوم کی پوری زندگی امت مسلمہ کے افکار وعقائد، اخلاق واعمال کی ناہمواری کو ہموار کرنے اور معاشرہ کی تعمیر میں بسر ہوئی اور اپنے زبان وقلم کا پورا زور اسی عظیم جدوجہد کے لیے صرف کرتے رہے۔

بڑے اشتیاق وتمنا اور اصرار کے بعد دیوبند آنے میں ان کو کامیابی مل گئی اور ۱۳۳۱ھ میں مولانا دارلعلوم دیوبند تشریف لائے، دورہ حدیث شریف میں داخلہ لے کر ۱۳۳۲ھ میں سند فراغت حاصل کی۔ اسی ایک سال کی قلیل مدت نے مولانا مرحوم کی زندگی میں جو انقلاب برپا کیا اور ان کی ذات کو کندن بنایا وہ بہت جلد ان کے زبان وقلم کی راہ سے نمایاں طور پر دکھائی دینے لگا تھا۔

عملی زندگی کا آغاز

طالبِ علم کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ جب تک اس کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہتا ہے اس وقت تک وہ دنیا کی تمام الجھنوں سے بے خبر آزادی کی زندگی گزارتا رہتا ہے؛ لیکن جب تعلیمی مرحلہ طے ہو جاتا ہے اور کاندھے پر کچھ ذمہ داریاں آجاتی ہیں تو پھر آنکھیں کھلتی اور عقل وہوش ٹھکانے لگتی ہیں۔

چونکہ مولانا گیلانی نے ۲۲ سال کی عمر میں ہی تعلیم سے فراغت حاصل کر لی تھی، اس لیے تعلیمی

سلسلہ منقطع ہونے کے بعد انہیں بھی فکر معاش دامن گیر ہوئی اور دل نے ٹونک کے سفر پر آمادہ کیا۔ ٹونک پہونچ کر استاذ محترم سے ملاقات ہوئی، صورت حال کا تبادلہ اور مقصدِ ورود کا اظہار ہوا۔ استاذ کی شفقت کہیے کہ ابتداء میں مولانا اپنے قدیم تعلیمی گہوارہ مدرسہ خلیلیہ کی لائبریری میں فہرست سازی کے کام پر مامور ہوئے۔ حسن اتفاق کہ چند دنوں بعد ہی وہاں ایک مدرس کی ضرورت محسوس ہوئی جس کے پیش نظر پندرہ روپے ماہوار پر مدرس کی جگہ ان کا تقرر ہو گیا۔ علاوہ ازیں ایک نواب زادے کو ٹیوشن بھی پڑھایا کرتے تھے۔ اس طرح سے تیس پینتیس روپے ماہانہ آمدنی پر مولانا گیلانی نے اپنی عملی زندگی کا سفر شروع کیا۔[۱۰]

لیکن مولانا کا حال ان کے عظیم مستقبل کو دیکھ رہا تھا۔ ان کی قدآوری اور بلند عزائم کے مقابلہ میں نہ تو یہ کام موزوں تھے اور نہ اس سے حاصل ہونے والی آمدنی کافی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مدرسہ خلیلیہ ٹونک کی فضا بھی اس شاہین صفت شخص کے لیے تنگ تھی۔ اس کی متجسس نگاہ کو کسی اور ہی جہان کی تلاش تھی۔ چار مہینے بھی ابھی گزرنے نہیں پائے تھے کہ قدرت نے ٹونک سے حیدرآباد پہنچا دیا۔ بعض بڑے لوگوں سے ملاقات ہوئی، چنداں کوشش کے بعد بھی جب ملازمت کی کوئی راہ نہیں نکل پائی تو پھر اپنے وطن واپس آ گئے۔

مولانا کے لیے مادر علمی دارالعلوم دیوبند کی چند سالہ خدمت مقدر ہو چکی تھی اس لیے ۱۳۳۴ھ کے اوائل میں وہ دیوبند آ گئے۔ مولانا حبیب الرحمان صاحب نے دس روپے ماہانہ مقرر فرما کر بروقت دو رسالے القاسم اور الرشید میں مضمون نویسی، اس کی ترتیب و تدوین بالفاظ دیگر اس کی ادارت اور درس و تدریس کی بھی کچھ ذمہ داریاں مولانا کے سپرد کیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ معین مدرسی اور تبلیغ و تقریر کے فرائض بھی انجام دیتے۔ ان کی حسن کارکردگی کے پیشِ نظر اربابِ حل وعقد نے بعد میں تنخواہ دس روپے سے بڑھا کر تیس روپے کر دی تھی اور مولانا بھی دل و جان سے اپنی پوری ذمہ داری کے احساس اور پوری خوش اسلوبی کے ساتھ تمام امور انجام دیتے رہے۔

مفتی ظفیر الدین مفتاحی صاحب رقم طراز ہیں:

> ''محرم ۱۳۳۳ھ یا اس کے آس پاس (مولانا گیلانی) ٹونک تشریف لے گئے چار پانچ مہینے مدرسہ خلیلیہ میں درس و تدریس کے فرایض انجام دئے،

وہاں سے نکل کر حیدرآباد پہنچے یہ پورا سال اسی سیر و سیاحت میں گزر گیا ۱۳۳۴ھ کے ابتدائی مہینوں میں دیوبند واپس ہوے۔''[۱۱]

اخیر سال میں جب وطن تشریف لے گئے تو کئی مہینے رہ گئے اور رائے میں بھی تبدیلی آ گئی اور خواہش یہ ہوئی کہ اپنے علاقہ مونگیر میں درس وتدریس کا سلسلہ قائم ہو جائے تو شاید بہتر ہوگا لیکن خدا کو منظور نہ تھا۔[۱۲]

جب واپسی میں تاخیر ہوئی تو دیوبند سے طلبی کا خط آیا، انھوں نے اس کا جواب بھی دیا۔ صورت حال سے مولانا حبیب الرحمان صاحب عثمانی نے تاڑ لیا کہ یہ نوجوان چوں کہ بڑے کام کا ہے اور مشاہرہ حسبِ منشا نہیں جس کی بنا پر یہ یہاں آنے سے لیت ولعل سے کام لے رہا ہے۔ مولانا عثمانی قدرے کرختگی مگر شفقت آمیز لہجے میں دوبارہ دیوبند آنے کو کہا۔ مفتی ظفیر الدین مفتاحی مولانا عثمانی کے خط کا مضمون نقل کرتے ہیں:

''یہ سب قصے تمہاری (مناظر احسن گیلانی) ناتجربہ کاری اور جوشِ جوانی کے ہیں۔ تمہارے لیے مناسب یہی ہے کہ تم دار العلوم آ جاؤ.....رہا مشاہرہ تو یہاں جو معیار ہے وہ زمانہ کے اعتبار سے پست ہے مگر تمہارے لیے طے کر دیا گیا ہے کہ تم کو تیس کے بجائے اب دارالعلوم پچاس دے گا۔''[۱۳]

مولانا نے ظاہر کو معمولی اور مولانا کے خیر خواہانہ اصرار کو اہم جانا اور بلا کسی تامل کے دوبارہ اپنی ذمہ داری از سر نو سنبھال لی۔ لیکن ان کا مستقلاً قیام کہیں اور ہی مقدر ہو چکا تھا اور مادر علمی دارالعلوم دیوبند کی خدمت قدرت کو زیادہ دنوں منظور نہ تھی۔ چناں چہ ۱۶ر ستمبر ۱۹۱۶ء کو کلکتہ میں ایک ناگہانی واقعہ پیش آ گیا جس سے مسلمانوں کو زبردست دھچکا لگا۔ دارالعلوم کی طرف سے وہاں ان کا جانا طے ہوا۔ پھر واپسی وہیں سے ہونی تھی۔ مولانا واپس ہی ہو رہے تھے کہ راستہ میں ہی عین عیدالاضحیٰ کا دن آ گیا جس کی وجہ سے وہ حیدرآباد اتر گئے۔ لیکن کسے معلوم تھا کہ آئندہ ایک طویل مدت کے لیے ان کا قیام اسی زمین پر لکھا جا چکا ہے۔ پھر وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اس کی صورت یوں بنی کہ وہاں مولانا حمید الدین فراہی سے ملاقات ہوئی، اور انھیں گفتگو وغیرہ سے مولانا کی شخصیت وعبقریت کا حال معلوم ہو گیا۔ یہی

وجہ ہے کہ انھوں نے نئی عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے پیش نظر مولانا کو دیوبندی عالم ہونے کے ناطے یونیورسٹی میں تقرر کے لیے درخواست دینے کا مشورہ دیا۔ بالآخر ۱۹۲۰ء میں وہ شعبہ دینیات کے استاذ مقرر ہو گئے اور درس و تدریس، تحقیق و تدقیق، تصنیف و تالیف اور نئی نسل کے اندر اسلامی ذہن پیدا کرنے کا ایسا حیرت انگیز کارنامہ انجام دیا ہے جو صدیوں تاریخ کا سرمایہ بن کر رہے گا۔ ۵۲ سال کے ایک طویل عرصہ تک یہ سنہرا سلسلہ پورے آب و تاب کے ساتھ چلتا رہا اور ۱۹۴۹ء میں اس شعبہ کے صدر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ پانچ سو روپے پینشن ملی۔[۱۴]

درس و تدریس

مولانا کی تدریسی خدمات بھی اپنے اندر ایک عظیم تاریخ رکھتی ہے۔ ان کے تدریسی سفر کا آغاز اپنے قدیم تعلیمی گہوارہ مدرسہ خلیلیہ ٹونک سے ہوا۔ اولاً وہاں ابتدائی کتابیں پڑھائیں، حیدرآباد چند دنوں رہے اور پھر دیوبند بلا لیے گئے، پھر سال ڈیڑھ سال کے بعد فیصلہ الٰہی نے حیدرآباد میں مستقل قیام کا سامان مہیا کر دیا اور عثمانیہ یونیورسٹی میں ان کا تقرر ہو گیا۔ مولانا وہاں بتدریج لکچرار، ریڈر، پروفیسر پھر آخر میں اسی شعبہ دینیات کے منصب صدارت پر فائز ہوئے اور ایک طویل عرصہ گزار کر ۱۹۴۹ء میں سبکدوش ہوئے۔ ٹونک و دیوبند میں باضابطہ آپ سے کون کون سی کتابیں متعلق رہیں، مولانا پر لکھی جانے والی تحریرات سے اس کی صراحت نہیں ملتی، البتہ قیام حیدرآباد کی تفصیلات میں حدیث کی بعض اونچی کتابوں کی تدریس کا سراغ ملتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ کسی بڑے ادارے خصوصاً جدید و قدیم طبقہ کے طلبہ کو پڑھانے، اس سے کہیں زیادہ اس کی سیرت سازی، اس کے اندر تعلیم کی اسپرٹ پیدا کرنے اور آئندہ اس کی ترویج و اشاعت کا وکیل بنانے کے لیے ایک ریڈر، لکچرر اور مدرس کے اندر جو اوصاف و لوازمات درکار ہوتے ہیں وہ سب پورے طور پر مولانا گیلانی کے اندر موجود تھے۔ ان کے اسلوب درس کو مولانا ہی کے ایک شاگرد جناب غلام محمد صاحب کے حوالہ سے مفتی ظفیر الدین صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> ''وہ بیٹھے تو آنکھیں بند کئے اور سر جھکائے رکھتے تھے، مگر جب بولتے تو ان کی زبان سے پھول جھڑتے تھے اور ان کی شگفتگی اور ذکاوت مخاطب کو

مسخر کر لیتی تھی۔''[۱۵]

یہ ایک حقیقت ہے کہ جب کسی مدرس کے اندر مطالعہ کی وسعت، انداز بیان کی ندرت اور دور حاضر کے تقاضوں پر گہری نظر ہو اس پر مستزاد خلاص بھی اس کا ہم رکاب ہو تو اس پر سونے پر سہاگا والا محاورہ صادق آتا ہے، مفتی صاحب آگے خود اس کی تصویر کشی یوں کرتے ہیں:

''جب بولنے پر آتے تو مسلسل بولتے چلے جاتے، معلوم ہوتا تھا علم و تحقیق کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔''[۱۶]

یہی وجہ ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں وہ طلبہ و اساتذہ میں مقبولیت کے اعلیٰ مقام پر دکھائی دینے لگے، ڈاکٹر غلام محمد صاحب کی تحریر میں اس کی بہترین تصویر دیکھی جاسکتی ہے:

مولانا گیلانی کی دقت نظر، وسعت فکر، علوم دینی میں ان کا تبحر اور مسائل حاضرہ پر ان کی علمی دیانت اور مجتہدانہ جرات، ان کی بے لوث خدمت اور جامعہ (عثمانیہ حیدرآباد) سے ان کی شیفتگی نے ان کی شخصیت کو ہر دور کے طلبہ اور ہر شعبہ کے اساتذہ میں ایسی عظمت اور محبوبیت عطا کر دی تھی۔ جو ان سے پہلے یا بعد کسی کو نہ مل سکی۔[۱۷]

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

اسی کو حکیم الاسلام قاری طیب صاحب کی تحریر میں یوں دیکھا جاسکتا ہے:

آپ اپنے علم و فضل، معلومات، کثرت مطالعہ، دقت نظر، نکتہ سنجی اور دقیقہ سنجی میں نادر روزگار تھے۔[۱۸]

اور مولانا ازہر شاہ قیصر مرحوم (جو ایک معروف ادیب و صحافی گذرے ہیں) کی مبنی پر حقیقت تحریر نے تو ان کی درسی خدمات و خصوصیات پر مہر تصدیق ثبت کر دی، لکھتے ہیں:

''آپ کے حلقہ درس سے بہترین علما اور اہل قلم حضرات نے تربیت پائی...اور وہ اپنے ذوق اور حضرت مولانا کی بزرگانہ توجہات سے بڑے بڑے علمی منصب کی ذمہ داریوں کو پورا کرا دینے کے قابل بن گئے۔ حیدرآباد میں حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی کی درسی خدمات گذشتہ حیدرآباد کی علمی زندگی کی ایک شاندار علامت تھی۔ جس طرح بغداد و غرناطہ اور قاہرہ میں

اسلامی خلافتوں اور حکومتوں کے زریں عہد میں دنیا کے بڑے بڑے علمائے دین کھینچ کھینچ کر وہاں پہونچ گئے تھے اور ان کی درسگاہوں سے علم وفن کے چشمے ابل رہے تھے، اسی طرح حیدرآباد کو اپنے وقت کا بغداد سمجھیے، اور مولانا مناظر احسن گیلانی کو اس گہوارہ علمی کا امام الحرمین یا امام غزالی۔''[۱۹]

تصنیف وتالیف

مولانا کو حیات جاودانی عطا کرنے والا حیرت انگیز کارنامہ ان کا تحریری دفتر اور اس کا بحرِ بے کنار ہے۔ مختلف علوم وفنون پر انہوں نے خامہ فرسائی کی ہے اور چھوٹی بڑی درجنوں کتابیں ان کے نہ تھکنے والے قلم سے نکلیں اور مقبول خاص وعام ہوئیں۔ مولانا مرحوم کی بہت سی تحریریں تو مرتب ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں؛ تاہم تحریر کا ایک بڑا ذخیرہ اب تک اہل علم کے سامنے کتابی شکل میں نہ آسکا۔ مرتب تحریریں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

تفسیر، حدیث ، فقہ :تذکیر بسورۃ الکھف، ادب قرآنی (کتابچہ)،تدوین قرآنی ، تدوین حدیث، تدوین فقہ

مذہب اور اخلاق و تصوف: الدین القیم ،مقالاتِ احسانی،مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ،کائنات روحانی

سیرت: النبی الخاتم، ظہور نور یا نیا میلاد نامہ، دربار نبوت میں حاضری

تذکاروسوانح :سوانح قاسمی (۳،۲،۱)سیرت ابوذر غفاری ،امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی ،مجددالف ثانی ، تذکرہ شاہ ولی اللہ ،سیرت بانی دارالعلوم دیوبند،بابارتن ہندی

تعلیم: ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت ۲،۱میرامجوزہ تعلیمی خاکہ

معاشیات: اسلامی معاشیات، اسلام اور نظامِ جاگیرداری وزمین داری

خودنوشت:احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن

مکتوبات:مکاتیبِ گیلانی مرتب: مولانامنت اللہ صاحب رحمانی

دیگر: ہزار سال پہلے،مضامین گیلانی، افادات گیلانی(الفرقان)

اس کے علاوہ ملک و بیرون ملک کے وقیع رسائل میں ان کے غیر مرتب مضامین کی ایک طویل فہرست ہے۔ جوتاریخ وسیاست، مذہب واخلاقیات،سوانح وشخصیات اورتراجم وادبیات وغیرہ پر مشتمل ہے۔

مولانا کا طرز تحریر کئی خصوصیات کی آئینہ دار ہے بے ساختگی، برجستگی وپختگی،قوت استدلال و استخراج،ایجاز واطناب،استعارات وکنایات اور بہت کچھ اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ان کی تحریر کی سب سے بڑی خوبی بے ساختگی تھی۔اسی کے ساتھ وہ زودنویس وزیادہ نویس بھی تھے۔زودنویسی کا یہ عالم تھا کہ ساڑھے سات سوصفحات کی ضخیم دوجلدوں پر مشتمل کتاب ہندودستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت صرف بیس روز میں لکھ ڈالی جس کی تصدیق خودانہیں کی تحریر سے ہوتی ہے:

قلم اٹھالکھنا شروع کیا،اب میں نہیں جانتا کہ پھر کیا ہوا،قلم رواں ہوا، چلا، چلتا گیا، بات میں بات کا خیال آتا جاتا تھااور میں لکھتا جاتا تھا، پانچ سوصفحوں کے لکھنے کے لیے بیٹھا تھا، وہی اس وقت ۷۵۰صفحات کی شکل میں آپ کے سامنے موجود ہے۔[۲۰]

خوداسی تحریر سے مولانا کے طرز نگارش کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں۔اگران کے ایجاز کودیکھنا ہےتواس کی سب سے عمدہ مثال النبی الخاتم ہے۔اس کتاب پرتبصرہ کرتے ہوئے مولانا ابوالکام آزاد نے کہا تھا:

> ’’اس ایجاز اور اختصار کے ساتھ سیرت پر اتنی جامع اور عمدہ کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔‘‘[۲۱]

اورمولانا منظور نعمانی نے لکھا:

> ’’دریا بکوزہ کی مثال دنیا کی کسی کتاب پر اس سے بہتر طور پر صادق نہیں آتی۔‘‘[۲۲]

مولانا کے اس فن پرآخری دلیل مولانا عطاءاللہ شاہ بخاری اس طرح پیش کرتے ہیں:

''النبی الخاتم کے ساڑھے چار سو عنوانات میں سے ہر عنوان پر ہفتہ تک تقریر کرسکتا ہوں۔''[۲۳]

اور اگر ان کے اطناب کا سرچشمہ دیکھنا ہے تو سوانح قاسمی کا مطالعہ کیا جائے کہ چند صفحات کو بنیاد بنا کر اس پر سیکڑوں صفحات کی تین جلدوں کے عظیم ستونوں پر علم وادب کی شاندار عمارت تیار کردی۔ مولانا نے مستقل ارادہ کر کے کچھ نہیں لکھا بلکہ اس کا محرک یا تو دینی حمیت وغیرہ ہوتا یا امت مسلمہ کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کا جزبہ خالص یا پھر کسی کی فرمائش اور اصرار پر کچھ لکھتے۔ اور جب نہ لکھتے تو ہفتوں مہینوں نہ لکھتے۔ اور جب قلم اٹھ جاتا تو رکنے کا نام نہیں لیتا۔ لکھنے بیٹھے تھے مضمون جب قلم نے سانس لیا تو معلوم ہوا کہ کتاب تیار ہو چکی ہے۔ مولانا کے ایک شاگرد کے حوالہ سے مفتی ظفیر الدین صاحب خود مولانا کا قول نقل کرتے ہیں کہ، ان کی کوئی تصنیف بھی باضابطہ تصنیفی پروگرام کے تحت انجام نہیں پائی، یہی ہوتا رہا کہ کسی نے کسی مضمون کی فرمائش کی، لکھنے بیٹھ گئے، جب لکھ چکے تو وہ مضمون نہ رہا، کتاب تیار ہوگئی۔[۲۴]

ان کی تحریر میں شدت نہیں ہوتی لیکن بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اپنی بات کہہ جاتے جو مخالف وموافق کے دلوں کو یکساں طور پر متاثر کرتی۔ یہ ان کی جادوئی تحریر کے حسن اور لب ولہجہ کی شیرنی ہی کا نتیجہ ہے۔ ابوسلمان شاہ پوری صاحب لکھتے ہیں:

''تحریر کا حسن، اس کی روانی، سواد حروف وتحریر سے اٹھنے والی سوز وگداز کی لہریں اور اس کی تاثیر قاری کے دل کو مسحور کردیتی ہیں۔[۲۵]

مولانا کی تحریر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے اندر منطقیانہ استدلال اور مجتہدانہ طرز استخراج بھی لیے ہوئے ہوتی ہے۔ اس طرح ان کی تحریر کا نقشِ اول ہی نقشِ جمیل ٹھہرتا۔

مولانا کے اندر ایک ملکہ یہ بھی تھا کہ وہ واقعات سے حیرت انگیز استنباطات بھی کرتے اور دلچسپ موشگافیاں بھی، علامہ انظر شاہ کشمیری فرماتے ہیں:

''وہ جب چاہتے ہیں تحقیق ومعلومات کی ان گراں مایہ موتیوں کو نوکِ قلم پر اٹھا کر صفحات پر بکھیر تے جاتے ہیں، نیز واقعات سے حیرت انگیز استنباطات اور مصنف کی تحریر سے دل آویز ودل چسپ موشگافیاں ان کا

خاص ملکہ اور مخصوص حصہ تھا۔ جب قلم اٹھاتے تو مطالعہ کی وسعت اور معلومات کی اتنی فراوانی ہوتی کہ لکھتے لکھتے بسا اوقات مولانا کا قلم موضوع سے بہت دور کا سفر کر جاتا، لیکن تحریر میں اس قدر جاذبیت، مٹھاس اور کشش ہوتی گو مطالعہ کے مسافر کے ذہن کی تھکاوٹ دور کرنے کا سامان مہیا ہو جاتا اور قاری تھوڑی دیر کے لیے ذہنی تفریح میں مشغول ہو کر پھر اپنی منزل کی طرف آمادۂ سفر ہو جاتا، یعنی طرزِ نگاش کی بے ساختگی کے پیش نظر قدرے کلام کی بے ربطگی بھی ربط کو ٹوٹنے نہیں دیتی۔ اور قاری بیک وقت گلشنِ معلومات کے رنگ برنگے پھولوں کی خوشبوؤں سے اپنے ذہن و دماغ کو معطر کر لیتا ہے اور اپنی روح کو فرحت بخشتا چلا جاتا ہے۔ مختصر ہوں یا ضخیم تصانیف دیگر خصوصیات کے ساتھ تاریخی مواد سے بھی لبریز اور اس کے شہ پاروں سے مزین ہیں۔ خلاصہ یہ کہ مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم کی تحریر بیش بہا معلومات کا خزانہ، متنوع افکار، رنگارنگ خیالات کا گنجینہ، سوز و گداز اور جذب و مستی کا آئینہ خانہ اور طرز و اسلوب کے حسن و جمال کا حسین گلدستہ ہے۔''

یہ تھی ان کی تحریری جولانی کی مختصر سیر، ورنہ ان کے لٹریچر کا بنظر عمیق مطالعہ اور لسانی تجزیہ کیا جائے تو بہت سی خصوصیات اور کئی ایک منفرد پہلو کا پتہ چل سکتا ہے جن کے مولانا خود ہی موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔

سفرِ آخرت

اللہ کے علاوہ تمام چیزیں فانی ہیں، علامہ گیلانی ہی کے بقول: ''زندگی ایک ایسا گھونٹ ہے کہ جس نے بھی اسے پی لیا اسے موت کا تلخ گھونٹ بھی اپنے حلق سے نیچے اتارنا پڑے گا۔'' چوں کہ مولانا وظیفہ یاب ہو کر اپنے وطن میں مستقل مقیم ہو گئے تھے، عبادت و ریاضت، مطالعہ و تصانیف کا مشغلہ انتہائی یکسوئی کے ساتھ چل رہا تھا، لیکن زندگی کے اواخر تین سالوں میں پے در پے کئی مرتبہ دل کا عارضہ پیش آیا اور اس نے شدت بھی اختیار کی لیکن ہر مرتبہ صحت یابی ہو جاتی تھی، اسی طرح انتقال سے چند

دنوں پہلے رمضان میں بھی بیماری کے دوشدید حملے ہوئے، علاج کیا گیا، چندے افاقہ ہوا، اور بظاہر ایسا معلوم ہونے لگا کہ آپ روبصحت ہوگئے، لوگوں کو اطمینان تھا، ۴ جون کو مولانا پر عجیب وغریب قسم کی بشاشت تھی لیکن کیا پتہ تھا کہ ان کی زندگی کی بہار چند لمحوں میں خزاں سے بدلنے والی ہے، بالآخر ۵/جون ۱۹۵۶ء کو علم وعمل، فکر وفن، تحقیق ونظر اور ادب وسخن کا یہ روشن چراغ ہمیشہ کے لیے بجھ گیا۔[۲۶]

مولانا مناظر حسن گیلانی کے تعلیمی تصورات

مولانا م مناظر احسن گیلانی ۱۳۳۴ھ کے ابتدائی مہینوں میں دیوبند پہنچے تھے اور وہاں دارالعلوم دیوبند میں مدرس اور ملازم بھی ہوگئے۔ اور ذی الحجہ ۱۳۳۵ھ تک بحیثیت خادم تدریس وتبلیغ خدمات بھی انجام دیں۔ مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا اور آپ کلکتہ کے راستے حیدرآباد چلے گئے جہاں آپ کو علوم جدیدہ کے ماحول میں اسلام کو پیش کرنا تھا۔

مولانا کے شاگرد رشید غلام محمد بی اے لکھتے ہیں:

> ''بات یہ ہے کہ ان دنوں جامعہ عثمانیہ کی روز افزوں وسعت وترقی کے ساتھ شعبہ دینیات میں ایک ٹھوس عالم کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ اتفاقاً ۱۹۱۹ء میں مولانا گیلانی کا حیدرآباد آنا ہوا اور یہاں حمید الدین فراہی سے ان کی ملاقات ہوگئی، علامہ فراہی اس جوہرِ قابل کو پہنچان گئے، مولانا نے خواہش کی وہ لکچررشپ کے لیے جامعہ میں درخواست دیں۔ مگر مولانا کو دیوبند سے اس قدر انس ہوگیا تھا کہ اس مشورہ کی تکمیل میں تامل ہی رہا۔ لیکن جب خود حضرات دیوبند نے اس مشورہ کی تائید فرائی تو مولانا کو اس کی تعمیل کرنا پڑی اور ۱۹۲۰ء میں بحیثیت لکچرر ''دینیات لازم'' جامعہ عثمانیہ سے متعلق ہوگئے۔ پھر عرصہ کے بعد شعبہ دینیات میں منتقل کئے گئے، پھر ریڈر رہے، اور پروفیسر ہوئے اور بالآخر اس شعبہ کی صدارت کو کئی سال تک زینت بخش کر ۱۹۴۹ء میں ریٹائر ہوگئے، وہ شعبہ کی جان تھے اور شعبہ دینیات ان کا مجسم ارمان۔''[۲۷]

دینی درسگاہوں سے نکل کر جب جدید تعلیم گاہ میں کام کرنے کا موقع ملا اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں سے ملاقات ہوئی تو دین اور دینی احکام ومسائل میں اور بھی پختگی آتی چلی گئی۔ پھر آپ ہی کے دور میں عبداللہ چکرالوی (اہلِ قرآن کا پیدا کردہ گروہ سامنے آ گیا تھا) جو اپنے کو اہل قرآن کہتا تھا اور حدیث رسولؐ کی حجیت کا منکر تھا۔ اس فرقہ کی کتابوں نے آپ کو جھنجوڑ دیا، اور آپ نے محسوس کیا کہ گمراہوں کا یہ گروہ اپنا فتنہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں پھیلانے کی کوشش کرے گا۔ اس لیے آپ کی سب سے زیادہ توجہ قرآن، حدیث اور فقہ پر رہی۔ چنانچہ تدوین قرآن، تدوین حدیث اور تدوین فقہ پر آپ بہت عمدہ کام کر گئے اور انہی ناموں سے کتاب بھی لکھ گئے۔

مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم

مسلمان بچوں کی تعلیم کی شروعات کس طرح کی جائے اور کن علوم کے ذریعہ کی جائے اس ضمن میں مولانا گیلانی فرماتے ہیں:

> ''ہمیں ابتدائی تعلیم کی مشکلوں کو حل کرنا ہے، قرآن پاک پڑھانے کے آسان طریقے کو تلاشنا ہے تاکہ قرآن پاک جلد سے جلد ختم ہو سکے۔ لوگ قرآن پاک پڑھانے کے لیے پہلے ''قوائد بغدادی'' یا ''یسرنا القرآن'' وغیرہ پڑھاتے ہیں اور اس سے تعلیم کا آغاز کرتے ہیں، میرے خیال میں یہ طریقہ غلط ہے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ پہلے بچے کو اردو پڑھائی جائے اور جب اردو داں ہو جائے تو اردو عبارت عربی خط میں چند روز پڑھائی جائے اس کے بعد قرآن شریف شروع کرایا جائے۔ اس سے کم از کم ایک سال کا وقت بچ جاتا ہے، لیکن ضرورت ہے کہ بچوں کے لیے ایسے قرآن چھپوائے جائیں جن میں خط کی بلکہ ہر حرف کی اور نقطے اور شوشے کی پوری احتیاط کتابت میں کی جائے تاکہ حروف اور نقطے بچوں کی نظروں میں مشتبہ نہ ہونے پائیں اور ہر حرف کی صرف ایک ہی شکل پورے قرآن کی کتابت میں اختیار کی جائے تاکہ اختلاف صورت اسی حرف کے پہچاننے میں

مشکوک نہ کرے۔ ہم نے بار بار کہا ہے کہ بے مقصد تعلیم قومی زندگی اور ملی حیات کے لیے ایک ذرہ کار آمد نہیں۔''[۲۸]

اس کے بعد ترکوں کی مثال دے کر مولانا نے بتایا ہے کہ کس طرح ترک قوم اپنے اوپر فخر کرتی ہے اور کس طرح ترک مدبروں نے تعلیمی حقیقت کا پتہ پالیا اور دین وطن کے دوگونہ جذبات کو باہم کس طرح ایک دوسرے سے ہم آغوش کیا ہے۔

مولانا گیلانی نے زور دیا کہ ہمیں تعلیم کا معیار بلند کرنا چاہیے۔ ہمیں دوسری غیر ضروری چیزوں سے دھیان ہٹا کر تعلیم کے وہ اسباب تلاش کرنے چاہیے جن کا مقصد تعلیم کا حصول ہو سکے۔ مولانا کے بقول:

''آج کل دیکھا جا رہا ہے کہ ہماری درسگاہیں اپنی عمارت اپنے سامان اور اپنے انتظامات میں بہت زیادہ نمائش میں مبتلا ہیں، ہماری گزشتہ تعلیم کے عہد میں ہماری مسجدیں ہمارے تعلیم کے کمرے اور ہال اور مسجد کا فرش ہی ہماری میزیں اور کرسیاں تھیں۔ صرف انہی دو مددوں کی کفایت کا اندازہ موجودہ گراں طریقہ تعلیم سے بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری بہتر سے بہتر درسگاہ بہتر سے بہتر مقصدوں کے ساتھ قائم ہوتی ہے لیکن اس کے بانیوں کی ساری محنت زمین، اینٹ اور چونے پر صرف ہو کر رہ جاتی ہے اور ان مبادی سے نکل کر غایت تک پہونچنا محال ہو جاتا ہے۔''[۲۹]

مولانا گیلانی کے بقول پوری توجہ کا مرکز صرف تعلیم پر ہونی چاہیے۔ جب ہم دوسرے لوازمات میں الجھیں گے تو تعلیم کا مقصد باقی نہیں رہ جائے گا یا۔ پھر ہم عیش پرست یا آرام پرست ہو کر رہ جائیں گے۔ دنیا کی زندگی سکون پر نہیں دائمی حرکت پر قائم ہے۔ غلط فہمی سے ہم سمجھتے ہیں کہ جس قدر سکون پائیں گے اسی قدر آرام اٹھائیں گے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے خاص طور پر بچپن کی محنت کو ضروری کہا ہے آپ کے بقول:

''بچپن سے محنت کا عادی ہونا چاہیے۔ طالب علمانہ زندگی میں یہ عادت

ایسی پختہ ہو جانی چاہیے کہ وہ تمام عمر کے لیے اس دولت کو اپنے قبضہ میں کرلیں۔ امتحان کی تیاری، ورزش، سفر اور تعلیم کی فراغت کے بعد جس شاہرہ زندگی کو اختیار کیا جائے وہ نوکری ہو، تجارت ہو، صنعت ہو، ہر ایک میں یہی جوہر ان کا بہترین رفیق زندگی ہوسکتا ہے۔ ہماری درسگاہوں کا بہترین فریضہ یہی ہے کہ وہ مسلمان طالب علموں کے یہ ذہن نشین کردیں کہ اب تمہاری زندگی صرف تمہاری محنت، جفاکشی اور جانفشانی پر موقوف ہے۔ یہ دنیا ایک تلاطم خیز سمندر ہے جس سے نکل کر ساحل تک سلامتی سے پہونچنا صرف ہمارے ہاتھ پاؤں چلانے پر موقوف ہے۔''[۳۰]

وحدت نظام تعلیم کا نظریہ

مناظر احسن گیلانی نے ایک تعلیمی تجویز یہ پیش کی کہ تعلیم کا نظام ایک ہو اور اسی لیے انھوں نے اپنی تعلیمی تجویز کا نام ''نظریہ وحدتِ نظام تعلیم'' رکھا۔ مولانا کا کہنا تھا کہ ''مسلمانوں کے درمیان جو نظام تعلیم قائم ہے عام طور پر جسے ''درس نظامی'' کے نام سے شہرت حاصل ہوگئی ہے اس کے متعلق لوگوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ مسلمانوں کے صرف وہی تعلیم کا نظام تھا۔ درحقیقت اسی نصاب میں اس عہد کی دفتری زبان فارسی کی نظم ونثر وانشاء وغیرہ کی بیسیوں کتابوں کے ساتھ ساتھ حساب، خطاطی وغیرہ کی مشق کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم عربی زبان کی کتابوں کے ذریعہ دی جاتی تھی۔

ابتدا سے آخر تک اس نصاب کے ختم کرنے کی مدت پندرہ سولہ سال سے کم نہ تھی اور اس پوری مدتِ تعلیم میں درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے علماء صحیح معنوں میں خالص دینیات کی کل تین کتابیں پڑھا کرتے تھے، یعنی چند مختصر فقہی متنوں کے سوا قرآن کے متعلق جلالین، حدیث میں مشکوۃ اور فقہ کے سلسلہ میں شرح وقایہ اور ہدایہ گو یہ ظاہر نام تو دو کتابوں کا لیا جاتا ہے لیکن عملاً ان کو ایک ہی کتاب سمجھنا چاہیے کیونکہ کچھ ابواب شرح وقایہ سے اور کچھ ابواب ہدایہ سے اس طور پر پڑھا دیئے جاتے تھے کہ جن ابواب کی تعلیم شرح وقایہ میں دی جاتی تھی ہدایہ کے ان ابواب کو نہیں پڑھایا جاتا تھا۔ اسی لیے میں اسے ایک شمار کرتا ہوں، زیادہ سے زیادہ میرے اس بیان پر اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ ڈھائی پارے

قرآن کی تفسیر بیضاوی کی مدد سے بھی پڑھائے جاتے تھے۔

اولاً یہ ڈھائی پارے ہر جگہ نہیں پڑھائے جاتے تھے۔ اگر بیضاوی کو بھی قرآن کے متعلق ایک کتاب شامل کرلیا جائے درس نظامی کے اندر تو مطلب کیا ہوا؟ یہی کہ پندرہ سولہ سال کی مدت میں گویا خالص اسلامی دینیات کی چار کتابوں کا پڑھنا دینی علوم سے مناسبت پیدا کرانے کے لیے کافی سمجھا جاتا تھا۔ ان چار کتابوں کے سوتعلیم کی اس طویل مدت میں طلبہ جو کچھ پڑھتے تھے، فارسی (یعنی دفتری زبان) کی مذکورہ بالا بیسیوں نظم ونثر کی کتابیں اور اس کے علاوہ منطق، فلسفہ، ہیئت، اقلیدس، ادب عربی، اور بعض ایسے عقلی وادبی علوم جنھیں خود مسلمانوں نے ایجاد کیا تھا، یعنی علم کلام، اور علم اصول فقہ، معانی وبیان وغیرہ ان ہی علوم وفنون کی اتنی کتابوں کو ختم کرنا ضروری تھا، جن میں صرف منطق وفلسفہ کی کتابیں آخری زمانہ میں چالیس پچاس سے زیادہ تھیں۔ دینیات کی عموماً تعلیم کے لیے جب تین یا زیادہ سے زیادہ چار کتابوں کا پڑھ لینا کافی خیال کیا گیا تھا، اور زیادہ وقت غیر دینی علوم ہی کی تعلیم میں صرف ہوتا تھا، تو آج بھی کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ غیر دینی علوم کے اس حصہ کو جس کے اکثر نظریات ومسائل مسترد ہو چکے ہیں، کم از کم دنیا میں ان کی مانگ باقی نہیں رہ گئی ہے، ان کو نکال کر عصر جدید کے مقبولہ علوم اور عہدِ حاضر کی دفتری زبان انگریزی کے نصاب کو قبول کر کے مذہب کی تعلیم کو ان ہی تین کتابوں کے معیار کے مطابق باقی رکھتے ہوئے دینی اور دنیاوی تعلیم کے مدارس کی اس تفریق کو ختم کر دیا جائے۔''[۳۱]

مولانا گیلانی کا مطلب تھا دینی اور دنیاوی علوم کے جو الگ الگ مدرسے قائم کئے گئے ہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ اگر ہم چاہیں تو کچھ نصاب کے اندر تبدیلیاں کر کے اور حکومت کو اس پر راضی کر کے کہ مسلمانوں کی تعلیم میں دین کا جو عنصر ہے اس عنصر کو لازم کر دیا جائے اور اس طور پر لازم کر دیا جائے کہ جیسے ''درس نظامیہ'' سے فارغ ہونے والے دین کا علم ان کتابوں کے معیار کے مطابق اپنے پاس رکھتے تھے، اسی طرح بی اے کی تعلیم سے فارغ ہونے والے اس زمانے میں بھی اس حد تک مذہب کے عالم ہو کر نکلا کریں، ایسی صورت میں الگ الگ مدارس قائم کرنے کی مسلمانوں کی ضرورت نہیں رہے گی یعنی کہ ہر عالم گریجویٹ ہوگا اور ہر گریجویٹ عالم بھی ہوا کرے گا اور اس طرح سے دین اور دنیا کی تفریق باقی نہ رہے گی۔

سرکاری اسکولوں میں عربی زبان کی تدریس

نصاب کی تبدیلی کے ذریعہ اگر جدید اور قدیم کے فرق کو مٹا دیا جائے تو ممکن ہے کہ سرکاری اسکولوں میں بھی عربی تعلیم کا بندوبست ہو جائے۔ مولانا گیلانی نے اپنی تجویز پیش کی:

> ''مسلمانوں کو چاہیے کہ حکومت کے سامنے عربی تعلیم کے لزوم کا مطالبہ پیش کرے، لیکن عربی پڑھانے کا طریقہ یہ اختیار کرنا چاہیے کہ پہلے بچوں کو بغدادی قاعدہ کے اصول پر عربی حروف ہجا سے آشنا کیا جائے اور اس طرح آشنا کیا جائے کہ جیسے اس وقت کیا جاتا رہا ہے، پھر ناظرہ قرآن بھی ہر بچے کو اسی طرح پڑھایا جائے جیسے اب تک رواج ہے، قرآن کے بعد یا موقع ہو تو قرآن کے ساتھ ان ہی عربی حروف کو ایک دوسری شکل یعنی خط نستعلیق سے بھی ان کو آشنا کیا جائے۔ یعنی اردو پڑھائی جائے اور یہ دیکھ لینے کے بعد کہ خواندگی کی قدرت بچے میں اردو کی پیدا ہو چکی ہے آئندہ اردو کو چھڑا کر فارسی کی ''آمدنامہ'' اور کچھ تھوڑی بہت مناسبت اس سے پیدا کرا کے عربی میں طلبہ کو لگا دیا جائے، یہی عربی پڑھتے ہوئے بی اے تک پہونچیں گے اور اس سلسلے میں کچھ تھوڑی بہت ابتدائی عربی کے بعد دینیات کی درس نظامیہ والی کتب ثلاثہ کے ختم کرانے کی کوشش کی جائے۔ عربی زبان کی تعلیم کا مطلب دینیات کی صرف ان ہی تین کتابوں کو پڑھانا ہوگا جو درس نظامیہ کے نصاب میں ذکر کی جا چکی ہیں۔''[۳۲]

اس طرح سے سرکاری اسکول کے ماتحت عربی تعلیم کو باقی رکھا جا سکتا ہے اور وقت ضرورت نصاب کو دنیاوی ضرورت کے حساب سے نئی کتابوں کو شامل کرنے کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کو بھی باقی رکھا جا سکتا ہے۔

جدید ماحول میں تعلیم حاصل کرنے والوں کی فکر

مولانا گیلانی کا بچپن اور تعلیمی زندگی سب دینی ماحول میں گزری، دینی علماء کی صحبت میں

رہے۔ کبھی کسی کالج یا یونیورسٹی کے اساتذہ سے تعلق نہیں رہا مگر قدرت نے جب آپ کو دیوبند سے حیدرآباد پہونچایا اور وہاں عثمانیہ یونیورسٹی کے استاذ مقرر ہوئے تو آپ کا تعلق علماء سے کٹ کر جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے ہوگیا۔

انگریزی ڈپلومیسی کی وجہ سے ان دونوں طبقوں میں کافی بعد تھا اور دونوں کی ایک دوسرے سے کافی دوری تھی، قدامت پسند انھیں گمراہ اور ملحد تک کہنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے اسی طرح جدید تعلیم یافتہ طبقہ علماء کو قدامت پسند، نئے تقاضوں سے بیگانہ، ترقی کی راہ میں حائل اور حالات زمانہ سے چشم پوشی کرنے والا سمجھتا تھا۔

مولانا گیلانی کے لیے عثمانیہ یونیورسٹی کا ماحول بالکل نیا تھا اور ساتھ ہی ساتھ انگریزی حکومت کے زیرِ سائے چلنے والی یونیورسٹی کے زیادہ تر اساتذہ جدید تعلیم یافتہ تھے۔ ابتدا میں مولانا گیلانی کو اس ماحول سے جوجھنا پڑا اور جدوجہد کرنی پڑی اور آخر کار مولانا نے کشادہ دلی سے ان سب کو متاثر کیا اور جدید تعلیم حاصل کرنے والے نوجوانوں کی فکر میں لگ گئے۔

مولانا جدید ماحول میں تعلیم حاصل کرنے والے نوجوانوں کے ذہن وفکر سے بہت اچھی طرح واقف ہو چکے تھے کہ افکار و انداز فکر کیا ہے اور یہ مذہبی تعلیم سے عملاً وعلما کس طرح دور ہیں۔ اس کے لیے مولانا نے سب سے پہلے ہاسٹل کی تجویز پیش کی جہاں پر قیام وطعام کا قیمتاً نظم ہو، جہاں ان نوجوانوں کی دینی نشو ونما اسلامی طرز سے ہو سکے اور ایسا ماحول ہو جہاں دین قیم کا نفوذ اور علمی اور عملی دونوں نہج سے دینی تربیت کا معقول انتظام ہو۔

مولانا کی اس کوشش کو لوگوں نے سراہا اور ضرورت محسوس کی کہ اگر اسلامی تعلیم کو زندہ رکھنا ہے اور جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کے اندر روح پھونکنی ہے تو اقامت خانوں کے بغیر یہ کام ممکن نہیں۔[۳۳]

ابتدائی مکتبی تعلیم کے پنجگانہ اصول

مولانا گیلانی نے ابتدائی تعلیم جو کہ مکتب میں حاصل کی جاتی تھی اس کے لیے پانچ اصول مرتب کیے:

(۱) بچوں کو صرف وہی چیز پڑھائی جائے جو استاذوں سے پڑھے بغیر نہیں سیکھی جا سکتی۔

(۲) اردو میں ترقی کرنے کے لیے اردو ہی کی کتابوں کا مسلسل سالہا سال تک پڑھے چلے جانا کوئی مفید نتیجہ پیدا نہیں کرتا بلکہ اردو میں قوت پیدا کرنے کے لیے فارسی اور فارسی میں قوی کرنے کے لیے عربی سکھانا ضروری قرار دیا جائے۔

(۳) عربی زبان کے صرف اسی حصے کو مسلمانوں کے لیے ضروری سمجھا جائے جس میں ان کی دینی معلومات ہیں۔ باقی عربی کے دوسرے حصے کو اعلیٰ تعلیم میں بطور اختیاری مضامین رکھا جا سکتا ہے۔ بلکہ اس کے اختصاص علماء بھی ماہر درجوں میں اگر پیدا کئے جائیں تو وہ ایک دوسری ضرورت ہے لیکن ہر پڑھے لکھے مسلمان کو جس عربی کی حاجت ہے، وہ صرف اسلامی ادبیات والی ہی عربی ہے۔

(۴) اس عربی کو قصہ کہانی کی کتابوں کے ذریعہ سکھانے کی جگہ خود قرآنی پاروں اور فقہی وحدیثی متون کے ذریعہ سکھانا زیادہ مفید اور ضروری ہے۔

(۵) اسلامی ادبیات والی عربی کے لیے نحوی وصرفی قواعد کے ان طول طویل سلسلوں کی حاجت نہیں جو کسی زمانہ میں دماغی تمرین اور ذہنی تشخیص کے لیے پڑھائے جاتے تھے۔[۳۴]

اعلیٰ تعلیم کا نصاب

مولانا گیلانی کا خیال تھا کہ اگر پنجگانہ اصول کے مطابق بچوں کو سرکاری اسکول میں تعلیم دی جائے گی تو میٹرک تک بچوں کے اندر اس قدر صلاحیت پیدا ہو سکتی ہے کہ آئندہ کی اعلیٰ تعلیم میں بھی کافی مدد ملے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے آپ نے فرمایا:

> ''آئندہ کلیاتی تعلیم کے نصاب میں قرآن وحدیث اور فقہ کی ان تین کتابوں کو بی اے تک کے چار سالوں میں دوسرے اختیاری ومتناسب مضامین کے ساتھ پڑھ کر ختم کر دیں جو قدیم درس نظامیہ میں دینیات کی آخری درسی کتابیں ہیں۔ تجربہ بتائے گا کہ انگریزی ادب اور جدید علوم میں سے متناسب علوم کا کوئی گروپ درس نظامیہ کے ان تین دینیاتی کتابوں کے ساتھ بخوشی جمع ہو سکتے ہیں، پھر بی اے کے بعد ایم اے کے

اختصاصی درجہ میں اپنی اپنی مناسبت کے لحاظ سے طلبہ جس فن میں خصوصیت پیدا کرنا چاہیں پیدا کر سکتے ہیں۔ ان خصوصی فنون میں جہاں جدید علوم وفنون میں سے کسی فن وعلم وزبان وغیرہ کا انتخاب کیا جا سکتا ہے وہیں بآسانی فقہ وحدیث، تفسیر، ادب عربی، بلکہ جی چاہے تو کوئی قدیم معقولات، منطق، کلام، فلسفہ، اصول وغیرہ کے مضامین بھی اختیار کر سکتا ہے۔ یہ ایسا نصاب ہوگا جو طلبہ کے لیے قدیم وجدید علوم والسنہ میں سے ہر ایک کے اندر خصوصیت پیدا کرنے کا ذریعہ فراہم کرے گا اور سب سے اہم اصول نفع نظام تعلیم کی اس وحدت کا وہی ہے کہ ملا اور مسٹر، علماء ولیڈر کی باہمی کشمکش کا سارا قصہ ختم ہوجائے گا، اب جو بھی ملک میں پڑھا لکھا یا صاحبِ علم وفضل ہوگا، وہ پہلے ملا ہوگا اس کے بعد جس مضمون کو اختیار کیا ہوگا اس کا ماہر قرار پائے گا۔ انشاء اللہ اس کے بعد ملا ہی مسٹر ہوں گے اور مسٹر ہی ملا ہوں گے۔ علماء ہی لیڈر ہوں گے اور لیڈر ہی علماء ہوں گے۔''[۳۵]

پھر آگے مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم کا حوالہ دے کر مولانا گیلانی فرماتے ہیں:

''بارہ سو سال تک مسلمانوں نے ایسا نصاب رکھا جسے ہم مرکب نصاب کہہ سکتے ہیں اسے جاری کر کے تعلیمی نظام میں ایسی وحدت پیدا کر دی تھی کہ اسی ہندوستان میں ایک زمانہ وہ بھی گزرا ہے کہ غیر مذہب کا آدمی بھی پڑھنا چاہتا تھا، تو اسے بھی اسی نصاب کی کتابیں پڑھنی پڑتی تھیں، جیسے کہ حکیم کامراں، دستور، ہبریدوغیرہ۔''[۳۶]

انگریزی اسکولوں میں عربی تعلیم کا لزوم

۱۹ویں صدی کے اندر مسلمانوں کا ایک عام مزاج بن گیا تھا کہ وہ انگریزی تعلیم سے دور بھاگتے ہوئے نظر آئے تھے۔ اس سلسلے میں مولانا مناظر احسن گیلانی فرماتے ہیں:

''کیا مسلمانوں کو یورپ کے علوم سیکھنے سکھانے سے محض اس لیے انار ہتی ہے کہ وہ یورپ کے علوم وفنون ہیں۔ لیکن اپنے آپ کو فانی کر کے محض دوسرے کے ساتھ باقی رہنے سے ان کو انکار تھا، خود ہی سوچا جا سکتا ہے کہ یہ انکار ان کا کس حد تک بیجا تھا۔ اگر تعلیم کا مقصد وہی ہے جو میں سمجھتا ہوں یعنی نہ جانی ہوئی چیزوں کو جاننے کی انسان میں جو قدرتی صلاحیت ہے اس قدرتی صلاحیت کو ابھارنے کی یہاں تک کہ طلبہ میں ایسی استعداد اور اس کا راسخ ملکہ پیدا ہو جائے، اور تعلیمی زندگی سے الگ ہونے کے بعد اپنے متعلقہ فنون کے حقائق ومسائل تک استاذ کی اعانت کے بغیر اس کی رسائی ہونے لگے، خود سوچنے کی اور دوسروں کی سوچی ہوئی باتوں کے سمجھنے کی خواہ وہ کسی قسم کی پیچیدہ اور دقیق تعبیر میں پیش کی گئی ہوں تنقید یا صحیح کو غلط سے جدا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو۔ اگر پڑھنے پڑھانے کا یہی مطلب ہے دوسرے لفظوں میں کہیے کہ چیزوں کے دکھانے پر زیادہ زور دینا مقصود نہ ہو، بلکہ دیکھنے کی قوت بڑھائی جائے جہاں تک بڑھ سکتی ہو۔ تعلیم صرف اس کا نام ہو اور دیکھنے کا کام تعلیم کے بعد کیا جائے تو میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے بزرگوں نے اسلامی علوم کی تعلیم کی جو راہ بنائی تھی، اس سے بہتر راہ کیا اور ہو سکتی ہے۔''

پھر آگے عربی تعلیم کے سلسلے میں بیان کرتے ہیں:

''عربی تعلیم مدارج کے لحاظ سے دو درجوں میں تقسیم تھی ایک ضرورت کا درجہ تھا، دوسرا فضل کا۔ ضرورت کے درجہ تک مذہب کی تعلیم حاصل کر کے جو تعلیم کو ختم کر دینا چاہتے تھے ان کی غرض فقط یہ ہوتی تھی کہ اپنا تشخص زندگی میں معمولی مذہبی اور دینی ضرورتیں جو ان کو پیش آئیں گی، ان ضرورتوں کی حد تک دین کے سمجھنے کی ان میں لیاقت پیدا ہو جائے، اس کے لیے صرف ونحو کی معمولی ابتدائی تعلیم کے بعد قدوری وغیرہ جیسی فقہی

متن کی کوئی کتاب پڑھادی جاتی تھی اور یہ اتنا مختصر نصاب ہوتا تھا کہ کوشش کرنے والے چاہتے تو چھ مہینے میں اسے ختم کر سکتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ذاتی ضرورتوں کے تحت مذہب کی اتنی تعلیم کافی نہ تھی۔ میں اسلامی مدارس کو انگریزی مدارس نہیں بلکہ انگریزی مدارس کو چاہتا ہوں کہ مسلمان بنا لیا جائے۔ رہے عربی مدارس، عام عربی مدارس کو ہائی اسکولوں میں تبدیل کر دیا جائے جن میں دینیات کی تعلیم میں صرف قرآن ہو، بڑے مراکز کو علوم کی تکمیل کے لیے کر لیا جائے۔ مثلاً تفسیر کے لیے ندوہ، حدیث کے لیے دیوبند، فقہ کے لیے فرنگی محل کوئی ادارہ اور کلام وتصوف کے لیے اجمیر میں کوئی انتظام کر دیا جائے۔ اور رہی اسکولوں اور کالجوں کی بات جس کی تعلیم کی مدت اس وقت مقرر ہے یعنی بی اے ہونے کے لیے کم از کم چودہ سال کی تعلیم ضروری ہے، کیا اس چودہ سال کی مدت یا چودہ سال کے نصاب میں دینیات کی ان تین کتابوں (قرآن، مشکوۃ، ہدایہ ووقایہ) کی جگہ نہیں نکل سکتی؟''[۳۷]

موجودہ دور کا امتحانی طریقہ غیر مفید

مولانا گیلانی آج کل کے اسکول یا کالج کے امتحان کے طریقوں سے غیر مطمئن نظر آتے ہوئے اور پرانے وقت کے امتحان یا بچوں کی جانچ کے طریقوں کو یاد دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مکتب خانوں کے اس قدیم طریقے کو دیکھنے والے موجود ہوں گے کہ چھوٹے بچوں کو مکتب خانوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا تھا، روزانہ استاذ ان سے پڑھی چیزوں کا آموختہ بالالزام سنتا تھا، اور جوں جوں بچے تعلیم میں آگے بڑھتے جاتے تھے بجائے روزانہ کے ہفتہ میں دوبار اور آخر میں ہفتہ میں ایک دن صرف آموختہ پڑھنے اور سننے کے لیے مقرر تھا، عموماً یہ دن یوم تعطیل (جمعہ) سے پہلے کا ہوتا تھا، لوگوں نے غور نہیں کیا کہ آخر یہ کیا چیز

تھی؟ اس میں شک نہیں کہ ایک طرف اس ''آموختہ'' کے اصول کا ایک فائدہ یہ تھا کہ جو کچھ بچوں نے پڑھا ہے وہ دن بدن پختہ سے پختہ تر ہوتا چلا جائے۔ اس کے ساتھ استاذوں کو اس کا بھی تو اندازہ ہوتا تھا کہ کس بچہ نے کس حد تک اپنے اسباق اور بتائی ہوئی باتوں کو یاد رکھا ہے، آموختہ کا یہ طریقہ اس وقت تک استعمال کیا جاتا تھا جب تک بچوں میں سمجھنے کی پوری قوت شگفتہ نہیں ہوتی تھی۔ زیادہ تر کام ان کے حافظہ سے لیا جاتا تھا۔ لیکن مکتبی تعلیم سے آگے بڑھ کر جب اعلیٰ تعلیم (درجہ افضل) میں طلبہ قدم رکھتے تھے تو اس وقت بجائے حافظہ کے مقصود اس چیز کا دیکھنا ہوتا تھا کہ طالب علم میں خود سوچنے کی اور دوسرے مفکرین کی سوچی ہوئی باتوں کے سمجھنے کی صلاحیت کس حد تک بڑھ رہی ہے، اس کے لیے آموختہ والا قاعدہ غیر مفید تھا یہاں ایک دوسرا قاعدہ مقرر تھا وہ قاعدہ استاد کے سامنے بحث وتحقیق کا تھا اور اپنی صلاحیت کو ظاہر کرنے کے لیے طلبہ کو مطالعہ میں کافی محنت کرنی پڑتی تھی۔ جس کا رواج افسوس ہے کہ نئے نظام تعلیم کے گونگے درس سے بالکل اٹھ چکا ہے۔ امتحان کے نام سے طلبہ کو جانچنے کا جو طریقہ جاری کیا ہے وہ مکتب خانے والے ''آموختہ'' سے زیادہ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ حکومت امتحان کے نام پر لاکھوں خرچ کرتی ہے اور تعلیم پانے والوں کے لیے دماغی کوفت کے سوا ہر سال امتحان کا مسئلہ ایک مستقل مالی سوال بنا ہوا ہے۔''[۳۸]

پرانے امتحانی طریقوں کی یاد تازہ کرانے کے بعد مولانا مناظر احسن گیلانی موجودہ امتحان کے طریقوں اور اس کے پڑنے والے اثرات کو بیان کرتے ہیں:

''موجودہ امتحان میں دس سوالوں میں سے پانچ سوالوں کے متعلق اگر ۳۳ فیصد چیزیں بھی امتحان دینے والے کے دماغ میں کسی طرح محفوظ رہ گئی ہیں، پاس کرنے کے لیے اتنی بات کافی ہے، لیکن خود سوچنے یا دوسروں کی

باتوں کے سمجھنے کی قابلیت میں اس نے کس حد تک ترقی کی ہے، عام طور پر امتحان کے اس مسرفانہ اور غریبوں کو تباہ کرنے والے طریقوں سے اس کا پتہ چلنا سخت دشوار ہے، اور اس کا یہ نتیجہ ہے کہ اختیاری سوالات میں سے ۳۳ فیصدی نمبروں سے پاس ہونے کے بھروسہ پر طلبہ کی اکثریت اپنے اسباق سے درس کے کمروں سے باہر کوئی تعلق اس وقت پیدا کرنا نہیں چاہتی جب تک امتحان کا موسم سر پر نہ آ جائے، استاذ کے لکچروں میں وہ ایک ایسا دماغ لے کر آتے ہیں جس میں ہونے والے سبق کے متعلق قطعا کسی قسم کی کوئی چیز نہیں ہوتی، جب تک استاد کچھ کہتا رہتا ہے، برے بھلے طریقوں سے اس کو یادداشت کی کاپیوں پر نوٹ کرتے جاتے ہیں، سبق ختم ہوا اور ان کا تعلق بھی اس وقت اپنے سبق سے ختم ہو گیا جب تک امتحان کی مصیبت ان کو آ کر نہ جھنجوڑے۔ تیاری امتحان کے نام سے ان کو جو فرصت دی جاتی ہے، فرصت کے ان چند دنوں میں کسی نہ کسی طرح کچے پکے لقمہ کی طرح حافظہ میں اپنے متعلقہ مضامین کے متعلق معلومات بھرتے چلے جاتے ہیں اور ٹھیک اسی طریقہ سے جیسے کسی کو قئے ہوتی ہے، جوابی کاپیوں پر جلدی جلدی نگلے ہوئے لقمے اُگل دئے جاتے ہیں، جہاں تک میرا تجربہ ہے اُگلنے کے اس عمل کے ساتھ ہی پھر وہ ان مضامین سے اس طرح کورے اور خالی ہو جاتے ہیں جس طرح پہلے تھے۔ دماغ میں اس کے بعد اگر کوئی چیز رہ جاتی ہے تو وہ صرف اس نتیجہ کا انتظار جس کی توقع اندھیرے میں چلائے ہوئے اس تیر کے بعد ان کے اندر پیدا ہو جاتی ہے۔''[۳۹]

تعلیم وتربیت کا انسانی مقصد

مولانا کی نظر میں تعلیم وتربیت کا حقیقی مقصد ہے کہ **علم الانسان مالم یعلم** (انسان جو نہیں جانتا ہے جانے) انسانی فطرت میں جو قدرتی صلاحیت ہے، اس کو جہاں تک ممکن ہو بروئے کار

لانے کے لیے چمکایا جائے، مانجھا جائے، دھویا جائے، صاف کیا جائے۔ قدیم تعلیم ہو یا جدید، سب کا نصب العین یہی رہا ہے۔ جو یہ کہتا ہے کہ جدید تعلیم آدمی میں ریل وموٹر بنانے، گراموفون اور ریڈیو کے ایجاد کرنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے، اور غریب عوام اس سے یہ سمجھ جاتے ہیں کہ واقعی دنیا کی عصری جامعات تعلیمی ادارے نہیں، بلکہ دستکاریوں کے کرگہ (کارگاہ) یا کارخانے ہیں، درست نہیں ہے۔

تعلیم کی غرض جو پہلے تھے وہی اب بھی ہے، پہلے بھی وہی **مالم یعلم** (جسے نہیں جانتا) (انہیں جانے) کی صلاحیتوں کی نشو ونما میں کوشش کی جاتی تھی، اور اب بھی جبلت بشری کی اسی عجیب وغریب قدرتی ودیعت کو ابھارنے اور اجاگر کرنے میں سارا زور صرف کیا جاتا ہے، خواہ وہ فنون کا شعبہ ہو یا سائنس (حکمت) کا۔[۴۰]

حواشی

۱۔ مفتی ظفر الدین، تلخیص وترجمہ فارسی آل خاندان سید احمد جاجنیری، بحوالہ حیات گیلانی، ص: ۲۵

۲۔ حیات گیلانی، ص ۲۹

۳۔ مولانا مناظر احسن، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت.....۲-۳

۴۔ مکتوب از مظفر گیلانی بحوالہ صدق جدید لکھنو ۳ ستمبر تا ۱۷ اکتوبر ۱۹۷۷ء، ص: ۲

۵۔ مولانا مناظر احسن گیلانی شخصیت وسوانح، ص: ۱۵

۶۔ مفتی ظفر الدین، حیاتِ گیلانی، ص: ۸۳

۷۔ مولانا عمران خاندان ندوی (مرتب)، مشاہیر اہلِ علم کی محسن کتابیں، ص: ۳۶

۸۔ حیاتِ گیلانی، ص: ۴۷

۹۔ مولانا مناظر احسن گیلانی، احاطہ دار العلوم میں بیتے ہوئے دن ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان، ۱۹۹۷ء ص: ۲۱

۱۰۔ ایضاً، ص: ۱۱۵

۱۱۔ ایضاً، ص: ۱۳۵

۱۲۔ مولانا مناظر احسن شخصیت وسوانح، ص: ۱۱

۱۳۔ حیاتِ گیلانی، ص: ۱۳۹

۱۴۔ رسالہ: معارف جلد ۷۹، نمبر ۳، اعظم گڑھ، ماہ شعبان المعظم ۱۳۷۶ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۵۷ء ص: ۲۴۵ تا ۲۵۰،

۱۵۔ محمد ظفیر الدین مفتاحی، حیاتِ گیلانی، مولانا یوسف اکیڈمی بنارس، ص: ۱۷۷

۱۶۔ ایضاً، ص: ۱۶۴

۱۷۔ مقدمہ مقالات احسانی،ص:۸
۱۸۔ پچاس مثالی شخصیات،ص:۱۴۷-۱۴۸
۱۹۔ یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ،ص:۴۶
۲۰۔ مولانا مناظر احسن گیلانی، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت،ص:۲۳
۲۱۔ رسالہ:الفرقان لکھنؤ نومبر ودسمبر ۱۹۸۶ء،ص:۴۷
۲۲۔ مناظر احسن گیلانی،مقدمہ النبی الخاتم
۲۳۔ رسالہ:الفرقان نومبر دسمبر ۱۹۸۶ء،ص:۴۷
۲۴۔ محمد ظفیر الدین مفتاحی،حیاتِ گیلانی ص:۲۰۴
۲۵۔ مولانا مناظر احسن شخصیت وسوانح،ص:۷۷
۲۶۔ محمد ظفیر الدین،حیاتِ گیلانی،مولانا یوسف اکیڈمی بنارس،ص:۳۰۲
۲۷۔ مقدمہ مقالات احسانی ص۷،بحوالہ حیات مولانا گیلانی (محمد ظفیر الدین مفتاحی) ص:۱۶۰)
۲۸۔ سید مناظر احسن گیلانی،مسلمانوں کی آئندہ تعلیم بحوالہ،عربی اسلامی مدارس کا نصاب ونظام تعلیم اور عصری تقاضے، ص:۱
۲۹۔ ایضاً،ص:۲
۳۰۔ رسالہ:معارف نمبر۳،جلد۳۲،دارالمصنفین اعظم گڑھ
۳۱۔ سید مناظر احسن گیلانی، میرا مجوزہ تعلیمی خاکہ،ص:۴، بحوالہ عربی اسلامی مدارس کا نصاب ونظام تعلیم اور عصری تقاضے،جلد چار خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ
۳۲۔ ایضاً،ص:۷
۳۳۔ محمد ظفیر الدین مفتاحی،حیات مولانا گیلانی،۱۹۱تا۱۹۵۱،مولانا یوسف اکیڈمی بنارس
۳۴۔ سید مناظر احسن گیلانی،عربی اسلامی مدارس کا نصاب ونظام تعلیم اور عصری تقاضے شمارہ۱،ص:۱۵۲
۳۵۔ ایضاً،ص:۱۵۳
۳۶۔ ایضاً،ص:۱۵۳
۳۷۔ سید مناظر احسن گیلانی، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت،حصہ اول،ص:۲۵۰
۳۸۔ سید مناظر احسن گیلانی مرحوم،عربی اسلامی مدارس کا نصاب ونظام تعلیم اور عصری تقاضے،شمارہ۱،ص:۱۴۷تا۱۵۰
۳۹۔ سید مناظر احسن گیلانی، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت،حصہ اول،ص:۳۱۶-۳۱۷
۴۰۔ سید مناظر احسن گیلانی، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت،حصہ اول،ص:۳۱۸

انیس الرحمن قاسمی *

مولانا محمد سالم قاسمیؒ اور علم حدیث

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی تعلیمات کی ترویج واشاعت میں حصہ لینے والوں کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دی ہے، فرمایا: "**نَضَّرَ اللّٰهُ إمرأ سَمِعَ مقَالَتی فوَعَاها وحَفِظَهاو بلَّغها**" (سنن ترمذی، **باب ماجاء فی الحث علی تبلیغ السماع**، حدیث۲۵۸۲، المکتبۃ الشاملۃ) اللہ تعالیٰ اس شخص کو سرسبز وشاداب رکھے جس نے میری بات سنی اس کو یاد کیا اس کو محفوظ رکھا اور اس کو آگے تک پہنچایا۔

ابتدائے اسلام سے عہد حاضر تک حدیث کا ایک خاص مقام رہا ہے۔ اسی کے پیش نظر علماء دیوبند نے احادیث مبارکہ کی مختلف پہلوؤں سے خدمت کی اور کررہے ہیں۔

علماء دیوبند میں بڑے عالم، فاضل، محدث پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی علمی لیاقت میں بڑی شہرت اور ناموری حاصل کی۔ انہیں میں سے حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ ہوئے ہیں جو ایک نامور اسلامی اسکالر، خطیب، ادیب اور محدث گذرے ہیں، جنہوں نے مختلف علوم وفنون پر درس وتدریس کے علاوہ کئی تصانیف بطور یادگار چھوڑی ہیں۔ موصوف کو چونکہ اسلامی تعلیمات بالخصوص قرآن وحدیث سے

* گیسٹ ٹیچر، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، ای میل: anisurrahmanqasmi@gmail.com

خاص طور پر شغف تھا لہٰذا انہوں نے تفسیر، سیرت، علم حدیث اور محدثین سے متعلق تدریسی خدمات انجام دیں اور کئی کتابیں تصنیف کیں۔

مولانا محمد سالم قاسمیؒ کی پیدائش ہندوستان کا مردم خیز علاقہ مغربی یوپی کے شہر دیوبند میں ۲۲/ جمادی الثانی ۱۳۴۴ھ بمطابق ۸/جنوری ۱۹۲۶ء میں ہوئی۔ حضرت مولانا محمد سالم قاسمی ایک معزز علمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جسے خانوادۂ قاسمی کہا جاتا ہے۔ آپ کا سلسلۂ نسب خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ تک پہنچتا ہے۔ اس خانوادہ کی ہندوستان آمد کے متعلق الامـــام الأکبـــر کے مصنف ڈاکٹر محمد اویس صدیقی نانوتوی فرماتے ہیں:

> ''سب سے پہلے اس خاندان کے جس فرد نے ہندوستان کا رخ کیا وہ قاضی مظہر الدین ہیں جو نویں صدی ہجری کے اواخر میں سکندر لودھی کے زمانے میں اس کی دعوت پر ہندوستان تشریف لائے۔ اس زمانہ میں نانوتہ واطراف میں جاٹوں نے سر اٹھایا جن کی سرکوبی کے لیے سکندر لودھی نے قاضی مظہر الدین کے فرزند قاضی میراں کی قیادت میں ایک لشکر بھیجا۔ لشکر کی کامیابی پر خوش ہوکر سکندری لودھی نے یہ علاقہ اس خاندان کے نام کر دیا۔ اس کے بعد سے اس خاندان نے نانوتہ میں بود و باش اختیار کی۔ پھر دار العلوم دیوبند کے قیام کے بعد مولانا قاسم نانوتوی اور ان کے اہل خانہ دیوبند کے ہوکر رہ گئے (الامام الاکبر، ص ۷۴۔۷۵)

مولانا محمد سالم قاسمیؒ نے اپنے والد مولانا قاری محمد طیبؒ کی نگرانی میں پرورش پائی۔ ۱۳۵۱ھ بمطابق ۱۹۳۳ء میں تعلیم کا آغاز ہوا۔ ناظرہ وحفظ قرآن کریم کی تکمیل جناب پیر جی شریف صاحب گنگوہی کے یہاں ہوئی۔ بعد ازاں فارسی کا چار سالہ نصاب مکمل کیا۔ آپ کے فارسی کے اساتذہ میں خلیفہ عاقل صاحب، مولانا ظہیر صاحب، مولانا سید حسین صاحب تھے۔ ۱۳۶۲ھ میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی سے عربی قواعد کی کتاب میزان الصرف پڑھی۔

علوم وفنون کی کتابوں میں کنز الدقائق حضرت مولانا سید اختر حسین میاں صاحب سے، میبذی قاری اصغر حسین صاحب سے، مختصر المعانی ونظم العلوم حضرت مولانا عبد السمیع صاحب سے اور

ہدایہ حضرت مولانا عبدالاحد صاحب سے پڑھی۔

ایشیا کی عظیم اسلامی درسگاہ دارالعلوم دیوبند سے آپ نے ۱۳۶۷ھ بمطابق ۱۹۴۸ء میں سندِ فراغت حاصل کی۔ آپ نے ماہرین علوم وفنون سے بھرپور استفادہ کیا، جن میں سرِ فہرست شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہویؒ، مولانا ابراہیم بلیاویؒ، مولانا فخر الحسنؒ اور شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلویؒ وغیرہ ہیں۔

خدماتِ علم حدیث

آپ کا اصل مشغلہ درس وتدریس رہا ہے۔ آپ کے بے شمار تلامذہ برصغیر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ درس نظامی کی تکمیل کے بعد آپ نے عملی زندگی دارالعلوم دیوبند سے شروع کی۔ ابتدائی درجات میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد بتدریج شرح عقائد، مشکوٰۃ شریف، سنن ابی داؤد اور بخاری شریف تک کا درس دیا۔ گویا یہاں انہوں نے تفسیر وفقہ ودیگر علوم وفنون کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا درس دیا۔ خطیب الاسلام نے تقریباً ساٹھ سال تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ اس زمانے میں ان سے ہزاروں طالبان علوم نبوت نے فیض حاصل کیا۔

آپ کی حیات مبارکہ کا یہ بہت اہم پہلو ہے کہ آپ نے چالیس سال سے جن علوم وفنون کو آپ نے پڑھایا ان میں علم حدیث کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ حدیث کی اہم ترین صحیح البخاری کا درس برسوں آپ نے بالترتیب دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم وقف دیوبند میں دیا۔ بغیر کسی تامل کے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حدیث مبارکہ کے ان مستند مجموعوں کا درس دینا کسی بھی انسان کے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے درس حدیث نے خطیب الاسلام کی سیرت وشخصیت کو رنگ وآہنگ اور وقار واعتبار عطا کیا اور یہی ان کی شناخت بن گئی تھی، بلکہ یہی ان کا سرمایہ تھا۔

آپ کے دروس علوم ومعارف سے بھرپور اور مواعظ وخطباتِ شریعت کے اسرار ورموز سے معمور ہوتے تھے۔ آپ ذاتی طور پر اخلاق فاضلہ کے حامل اور خاندانی علم ووقار سے آراستہ تھے، طویل عرصہ تک تدریس حدیث کی خدمت میں مشغول رہے۔

مولانا محمد سالم صاحب کو تدریس وخطابت کے ساتھ ساتھ تحریر وانشاء پردازی سے کافی دلچسپی

تھی۔متعدد مفید کتابیں آپ نے تحریر فرمائیں۔آپ کی چند مشہور کتابوں میں سے مبادی التربیۃ الاسلامیہ، تاجدار ارض حرم کا پیغام اور مرد غازی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔علاوہ ازیں تعلیم بالغاں کے لیے آپ نے ایک فاصلاتی کورس ''دینیات'' کے نام سے جاری کیا جس کا فیض دور دور تک پھیلا۔

ہندوستان میں علم حدیث

علوم الحدیث میں جو بلند پایہ خدمات ہمارے ملک ہندوستان کے علما اور محدثین نے انجام دی ہیں، اس کی نظیر گذشتہ تین چار صدیوں میں سارے عالم اسلام میں نہیں ملتی۔چنانچہ ابتدا میں ابومعشر نجیح السندھی، اسماعیل بن موسیٰ بصری وارد سندھ، منصور بن حاتم نحوی، ابراہیم بن محمد دیبلی، خلف بن محمد دیبلی، احمد بن محمد المنصوری، ابومحمد عبداللہ المنصوری، فتح بن عبداللہ سندھی، رضی الدین حسن الصغانی، شیخ محمد طاہر پٹنی، شاہ عبدالحق محدث دہلوی نیز ان کے علاوہ بے شمار محدثین نے علم حدیث پر نمایاں کارنامے انجام دیئے۔

یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ہندوستان میں باقاعدہ علم حدیث کے نظام کو عام کیا۔اس سے قبل بھی ہندوستان میں مختلف مقامات پر محدثین نے کوششیں کیں مگر جو مقبولیت حضرت شاہ صاحب کے درس حدیث کو ملی وہ کسی اور کے حصہ میں نہیں آئی۔

حضرت شاہ صاحب نے تدریس حدیث کا ہندوستان میں وہی طریقہ اختیار کیا جو عرب میں رائج تھا۔عرب میں درس حدیث کے تین طریقے رائج تھے:

(۱) پہلا طریقہ سرد روایت: یعنی طالب علم اپنے نسخے سے روانی کے ساتھ پڑھتا ہوا چلا جائے اور شیخ اپنے نسخہ سے اس کا مقابلہ کرتا رہے نہ سند پر کوئی کلام، نہ متن کی کوئی تشریح۔

(۲) دوسرا طریقہ بحث وحل کا: کہ مشکل مقام، پیچیدہ ترکیب یا سند میں کوئی غیر معروف نام یا ایسے سوالات جو خود بخود پیدا ہوتے ہوں تو ان کی مختصر وضاحت کرتے ہوئے آگے بڑھ جانا۔

(۳) تیسرا طریقہ امعان وتعمق کا تھا: بایں طور کہ سند کے رجال کا تفصیلی ذکر، جرح وتعدیل کے اعتبار سے راوی کا مقام، سند کے اتصال اور انقطاع کی تشریح، اس طرح الفاظ حدیث کے لغوی اور مرادی معنی کی وضاحت، مقصد عبارت کی تعیین، فقہ حدیث پر گفتگو کرتے ہوئے

متعارض حدیثوں میں تطبیق، ترجیح اور ناسخ ومنسوخ کی وضاحت وغیرہ۔غرض ہر کلمہ کے مالہ وماعلیہ کو تفصیل سے بیان کرنا تیسرا طریقہ رہا ہے۔

شاہ صاحب نے عرب محدثین سے استفادہ کے بعد ہندوستان میں آکر دوسرے اور تیسرے طریقے پر درس حدیث کے سلسلے کو جاری فرمایا اور جن ابواب میں بحث کی ضرورت نہ ہوتی ان کی سردا ً قرأت پر اکتفا کرتے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے علوم کی وراثت ان کے فرزند ارجمند شاہ عبد العزیزؒ (م۱۲۳۹ھ) کی جانب منتقل ہوئی۔ شاہ عبد العزیز کے علوم کی میراث آپ کے نواسہ شاہ اسحاقؒ (م۱۲۶۲ھ) کے حصہ میں آئی اور شاہ اسحاقؒ کے ذریعہ علم حدیث کا سلسلہ خوب پھیلا۔شاہ اسحاقؒ کے بہت سے لائق شاگردوں میں شاہ عبد الغنی مجددیؒ (م ۱۲۹۶ھ) اور میاں نذیر حسین محدث دہلویؒ تھے۔شاہ عبد الغنی کے شاگردوں میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (م۱۲۹۷ھ) مولانا یعقوب نانوتویؒ (م ۱۳۰۰ھ) مولانا محمد مظہر نانوتویؒ (م۱۳۰۲ھ) اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (م۱۳۲۲ھ) ہیں جو فکر دیوبند کے اولین پیشوا اور امام ہیں۔

ان کے بعد شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے اس طرز کو عام فرمایا۔حضرت شیخ الہند کے بعد ان کے شاگرد علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ وغیرہ اسی نہج پر اپنے تلامذہ (جن میں ایک نام سرفہرست مولانا محمد سالم قاسمی صاحب کا بھی شامل ہے) کی بھی تربیت فرمائی۔

محدثین عظامؒ کے اس عالی مرتبت قافلہ کے سالاروں میں سے ایک مولانا محمد سالم نے تاحیات اپنے اکابرین کے نہج کا خاص خیال رکھا اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے رائج کردہ تینوں طریقوں یعنی سرد روایت، بحث وحل اور امعان وتعمق کا حسب ضرورت خیال رکھ کر درس حدیث دیا۔ بخاری شریف کے درس میں موصوف عقیدۂ اہل سنت والجماعت کی دعوت وتبلیغ، فکری اعتدال اور مسائل کو نصوص قرآن وحدیث پر منطبق کر کے دلائل عقلیہ ونقلیہ کی روشنی میں وضاحت کرتے، حدیث میں مذکورہ مسئلے سے متعلق ائمہ اربعہ کے مسالک کا ذکر فرماتے اور پھر مسلک حنفی کے ترجیحی دلائل ذکر کرتے۔موصوف مسائل فقہیہ سے زیادہ حدیث کے معنی اور مقصد عبارت پر گفتگو کرتے۔

محدثین عظام کے سامنے ارشادات نبوی کا ذخیرہ ہوتا ہے اس لیے وہ ان ارشادات کی روشنی

میں ہرانسان کی کسی بھی مسئلہ میں بہترین اور سب سے عمدہ رہنمائی کرتے ہیں۔موصوف کو حدیث پاک سے ایک لمبے عرصے تک خاص شغف رہا اس بنیاد پر آپ کے سامنے جب بھی کوئی شخص ذاتی ،ملی یا دینی مسئلہ رکھتا تو موصوف جو اس مسئلہ کا سب سے بہترین حل ہوتا، وہ تجویز فرمادیتے۔

اجازتِ حدیث اور مولانا محمد سالم قاسمی

مولانا محمد سالم قاسمی کو حدیث کی مختلف کتب (صحاح ستہ، مسانید، معاجم، جوامع وغیرہ) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل اسانید کے ساتھ اجازت حدیث حاصل ہے اور آپ کی سند عالی ہے اس لیے آپ جہاں تشریف لے جاتے اصحابِ علم وفضل کی یہ خواہش رہتی کہ آپ نے جن شیوخ سے اجازت حدیث حاصل کی انھیں بھی آپ کے توسط سے نسبت اور اجازت حدیث حاصل ہوجائے۔

قبل اس کے کہ ان جگہوں یا مقامات کا تذکرہ کروں جہاں آپ نے بہت سے علما کو اجازت حدیث عطا کی، آپ کے ان اسناد کا تذکرہ کردوں جن اسناد سے اور جن محدثین سے آپ کو اجازت حدیث حاصل ہے۔

(۱) آپ کو سب سے پہلے اجازت حدیث حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے حاصل ہے، جن کی سند حضرت شیخ الہند کے توسط سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ تک پہنچتی ہے۔

(۲) دوسری اجازتِ حدیث اپنے والد حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ سے ملی جن کی سند علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے توسط سے شاہ ولی اللہ تک پہنچتی ہے۔

(۳) تیسرا سلسلۂ سندِ حدیث آپ کے والد سے۔ان کو اپنے والد حضرت مولانا احمد صاحب سے ،ان کو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے اور پھر یہ سلسلہ شاہ ولی اللہ تک پہنچتا ہے۔

(۴) چوتھا سلسلۂ اجازت حدیث تمام کتب متداولہ اور مسلسلات کا حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے واسطہ سے شاہ ولی اللہ تک پہنچتا ہے۔

(۵) پانچواں سلسلۂ اجازت حدیث اپنے والد سے شیخ ابومحمد عبداللہ محدث کے توسط سے حاصل ہے جن کی سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ہے۔

(۶) آپ کو اجازت حدیث کا چھٹا سلسلہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی سے حاصل ہے، آپ

نے ان سے مدینہ منورہ میں حدیث کی تمام کتبِ احادیثِ متداولہ اور اربعین امام نووی کی اوائل حدیث کی اجازتِ حدیث حاصل کی اور شیخ الحدیث کا سلسلہ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے توسط سے شیخ عبدالقیوم بڈھانوی تک اور ان سے حضرت شاہ ولی اللہ تک پہنچتا ہے۔

(۷) آپ کو ساتواں سلسلہ اجازت حدیث جدہ کے ایک بہت بڑے عالم محدث شیخ عبداللہ بن احمد بن محسن الیافعی سے حاصل ہوئی۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا موصوف ایک مرتبہ حجاز مقدس کے سفر پر گئے، دوران سفر معلوم ہوا کہ جدہ میں ایک بہت بڑے محدث عبداللہ بن احمد ہیں لہذا ان سے ملاقات کے لیے ان کے مسکن تک تشریف لے گئے تاکہ ان سے اجازت حدیث حاصل کر سکے، چنانچہ ان کے پاس پہنچے انہوں نے استقبال کیا، موصوف نے ان سے اجازت حدیث کی درخواست کی، شیخ عبداللہ بن احمد نے فرمایا حدیث کی اجازت دوں گا مگر ایک شرط پر۔ حضرت نے دریافت کیا وہ شرط کیا ہے؟ فرمایا کہ پہلے آپ مجھے اپنی سند سے حدیث کی اجازت مرحمت فرمائیں گے پھر میں آپ کو اپنی سند کی اجازت دوں گا۔ حضرت نے شرط منظور فرمالی، حسب وعدہ پہلے موصوف نے ان کو اپنی تمام سندوں کی اجازت دی پھر انہوں نے آپ کو اپنی تمام سندوں کے ساتھ صحاح ستہ کی اجازت حدیث مرحمت فرمائی۔ اس واقعہ کو مولانا محمد اسامہ صدیقی نانوتوی نے اپنی کتاب ''سیرت وشخصیت خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی'' کے جلد دوم صفحہ ۵۶۔۵۷ میں درج کیا ہے۔

ان سات طرق اور سلسلوں سے مولانا موصوف کو اجازت حدیث حاصل ہے۔

مختلف مقامات پر اجازت حدیث

امت نے بالکل ابتدائی زمانے ہی سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کی حفاظت کا اہتمام فرمایا۔ علمائے اسلام میں یہ طریقہ رائج ہے کہ وہ اپنی سند کو عالی کرنے کے لیے اور اپنے درمیان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان واسطوں کو کم کرنے کے لیے ان علماء سے حدیث کی اجازت لیتے ہیں جن کی سند ان کے مقابلے میں عالی ہوں اور علمائے محدثین بھی علم حدیث کی اشاعت کے لیے اور برکت کے حصول کے لیے اپنی اپنی عالی سندوں سے اجازت دینے کا اہتمام کرتے ہیں۔

آج جو علما مدارس اسلامیہ میں درسِ حدیث دے رہے ہیں ان کے اعتبار سے مولانا موصوف کی سندِ حدیث عالی تھی اور آپ کو مختلف طرق سے حدیث کی اجازت حاصل تھی، اس لیے جہاں بھی آپ تشریف لے جاتے تو وہاں کے علماء وفضلاء اس بات کا اہتمام فرماتے کہ موصوف سے حدیث کی اجازت لے لیں۔ دنیا بھر میں بہت ساری جگہوں پر اجتماعی وانفرادی طور پر مولانا موصوف نے علماء کو حدیث کی اجازت دی ان میں سے چند جگہوں کا ذکر برمحل ہوگا۔

آپ نے دارالعلوم دیوبند کے علاوہ دیگر مدارس میں بھی بخاری کی چند احادیث کا درس دے کر ختم بخاری شریف کرائی۔ مثلاً ۲۰۱۴ء میں مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کی دعوت پر آپ نے سفر فرمایا اور وہاں آپ نے بخاری شریف ختم کرائی۔ تمام اساتذہ وذمہ داران ودیگر بہت سے علماء اس مجلس میں موجود تھے۔ آپ نے بخاری شریف کی آخری حدیث پڑھائی اس کے بعد ان علماء واساتذہ ودیگر فارغین طلبہ کو اجازت حدیث مرحمت فرمائی۔ مدرسہ نورالاسلام میرٹھ میں ہمیشہ آپ ہی بخاری شریف ختم فرماتے اور حدیث کی اجازت فارغین طلبا دورۂ حدیث کو مرحمت فرماتے۔ اس طرح نہ جانے کتنے حضرات ہیں جن کو آپ نے اجازت حدیث مرحمت فرمائی اور ان کی سند آپ کے توسط سے عالی ہوئی۔

جامعہ اشرف المدارس کراچی پاکستان میں بے شمار فارغین علما کو اجازت حدیث مرحمت فرمائی۔ اس کے علاوہ آپ پاکستان کے بے شمار مدارس تشریف لے گئے اور علمائے کرام کو اجازت حدیث عنایت فرمائی۔

ایک مرتبہ شعبان المعظم میں افریقہ کا سفر ہوا۔ اس موقع پر انہوں نے دارالعلوم زکریا، جوہانس برگ میں ختم بخاری کا درس دیا، اس درس میں بڑے بڑے علماء نے شرکت فرمائی تھی۔ اس مجلس میں علماء اور فارغین طلبا کو اجازت حدیث مرحمت فرمائی۔

۲۰۱۴ء میں موصوف کا ایک سفر زامبیا کے لیے ہوا جہاں الجامعۃ الاسلامیہ لوساکا، زامبیا میں ختم بخاری شریف کرائی اور فارغین حضرات کو اجازت حدیث مرحمت فرمائی۔

حرمین شریفین میں اجازت حدیث

مولانا موصوف حرم مکی میں بغرض حج تشریف فرما تھے، بہت سے عرب علماء کو جب خبر ہوئی

کہ ہندوستان کا مؤقر ادارہ دارالعلوم وقف دیوبند کے جلیل القدر محدث وشیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب تشریف فرما ہیں تو علماء عرب آپ کے قیام گاہ تشریف لائے اور مولانا موصوف سے علیحدہ علیحدہ مجلسوں میں آکر حدیث کی اجازت حاصل کی۔

علماء مدینہ منورہ اور اجازت حدیث

جب دیار حبیب صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضری ہوئی اور علماء مدینہ کو علم ہوا کہ حضرت تشریف لائے ہوئے ہیں تو وہ حاضر خدمت ہوئے اور انہوں نے آپ سے اجازت حدیث کی درخواست کی چنانچہ آپ نے ان علماء کو اجازت حدیث مرحمت فرمائی اس مجلس میں پاکستان سے تشریف لائے ہوئے پیرذوالفقار نقشبندی بھی موجود تھے۔

مدینہ منورہ میں ہی مقیم ایک شامی عالم ومحدث شیخ محمد العوامہ کو اجازت حدیث دی اور انہوں نے مولانا موصوف کو اپنے سلسلوں سے حدیث کی اجازت عنایت فرمائی۔

مفتی الدیار المصریہ شیخ علی جمعہ کو اجازت حدیث

مولانا کا تقریبا ہر سال مصر کا سفر ہوتا، ایک مرتبہ جب جامعہ ازہر کے علماء کو معلوم ہوا کہ ہندوستان کے بڑے جلیل القدر محدث اور عالم اسلام کا مشہور ومؤقر ادارہ دارالعلوم دیوبند کے سرپرست مصر تشریف لائے ہوئے ہیں۔تو وہ سب آپ کے قیام گاہ تشریف لائے اور انہوں نے اجازت حدیث کی درخواست کی چنانچہ آپ نے انہیں اجازت حدیث مرحمت فرمائی۔انہیں میں مصر کے مشہور عالم ،محدث اور فقیہ شیخ علی جمعہ بھی تھے انہوں نے آپ سے درخواست کی کہ آپ مجھے اجازت حدیث مرحمت فرمادیں۔موصوف نے بھی ان سے اجازت حدیث کی درخواست کی،غرض دونوں نے اپنی اپنی سندوں سے ایک دوسرے کو اجازت حدیث عطا کی۔

مذکورہ بالا چند جگہوں کا تذکرہ بطور مثال کردیا گیا ورنہ نہ جانے کہاں کہاں اور کن کن محدثین کو آپ نے حدیث کی اجازت دی اور دنیا بھر کے مشہور محدثین نے آپ کو بھی اجازت حدیث مرحمت فرمائی۔

مذکورہ بالا چند حضرات کے نام جنہوں نے آپ سے اجازت حدیث حاصل کرنا اپنی زندگی کے لیے سرمایۂ افتخار سمجھا، وہ کوئی معمولی حضرات نہیں بلکہ وہ عالم اسلام کی مشہور ومعروف شخصیات ہیں۔اس سے مولانا موصوف کی محدثانہ شان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اللہ رب العزت نے آپ کو کس قدر عالی مرتبہ اور بلند مقام عطا فرمایا تھا۔ **ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء.**

علم میں تعمق وگہرائی

علم ومعرفت کے دروازے کسی بھی انسان پر جب ہی کھلتے ہیں جب وہ اپنے آپ کو باطنی امراض سے پاک وصاف کرلیتا ہے۔اگر شفافیت نہیں تو قلب پر فیضان علم نہیں ہوتا بلکہ محروم ہی ہوجاتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی محدث صحیح معنوں میں محدث کہلانے کے لائق جب ہی ہوتا ہے جب اس کے علم میں گہرائی ہو اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک قلب میں شفافیت نہ ہو۔حضرت خطیب الاسلام کے علم میں جو تعمق تھا وہ شفافیت قلب کی وجہ ہی سے تھا۔

اس تعمق فی العلم کے اثرات زندگی کے ہر پروگرام، آپ کی ہر تحریر اور آپ کی ہر تقریر اور درس وتدریس کے وقت واضح طور پر نظر آتے ہیں۔قاعدہ یہ ہے کہ جس کا قلب جتنی شفافیت لیے ہوئے ہوگا اتنا ہی تعمق فی العلم اس کو حاصل ہوگا۔جب انسان کو قلبی غذا ذکر وفکر کی وجہ سے مل گئی تو دماغی غذا یعنی علم بھی مل جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے حضرات صحابہ کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا **وأعمقھم علما** کہ علمی درک، تعمق فی العلم اور گیرائیت سب سے زیادہ حضراتِ صحابہ کو ملا تھا۔ہر زمانہ میں بڑے صاحب علم وفضل گذرے، مگر حضرات صحابہ جیسا علم ومعرفت کسی کو نہیں ملی کیونکہ ان کے قلوب میں جو شفافیت اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے پیدا ہوئی تھی اس درجہ کی شفافیت بعد میں آنے والوں کو نہیں ملی۔بہرحال ایک محدث کے لیے تعمق فی العلم اور علمی گیرائی انتہائی ضروری ہے اور یہ بغیر شفافیت قلب کے پیدا نہیں ہوتی۔

یوں تو موصوف میں تمام دینی خصوصیات وکمالات بہ درجہ اتم موجود تھیں اور انہوں نے اپنے پیش رو اکابر ومشائخ کی طرح قرآن وحدیث، فقہ واصولِ فقہ، تزکیہ وتصوف اور خطابت کے میدانوں کی شہ سواری کی لیکن ساتھ ہی ادبی میدان میں بھی موصوف نے اپنے قلم سے بے شمار درِ نایاب موتی

بکھیرے ہیں۔کہیں نئی نئی اصطلاحات،تو کہیں انوکھے والہیلے طرز وانداز،کبھی خطابت کی گرمی میں ڈوبی پرسوز آواز،تو کبھی تصوّف کی مستی ووارفتگی لٹاتی تحریریں۔

مولانا موصوف دور حاضر کے طبقہ علماء کے خواص میں نہیں اخص الخواص میں تھے، بلکہ کہنا چاہیے کہ اپنی دِقت نظر ونکتہ رسی کے لحاظ سے فرد فرید اور اپنی نظیر بس آپ تھے۔

مولانا بیک وقت مفسر،محدث،فقیہ،متکلم ومعقولی وصوفی تھے۔قوتِ خطابت کا جو ملکہ مولانا کو حاصل تھا اس سے طبقہ علماء بخوبی واقف ہے۔خیالات میں وسعت اور رواداری تھی،خوش عقیدگی اور روشن خیالی،رسوخ فی الدین اور رواداری کی ایسی جامعیت کی نظیر شاید ہی مل سکے۔

مولانا قاسمی کی زندگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے شیفتگی اور تعلق غایت درجہ کا تھا۔اسلام اور اسلامی تعلیمات پر جان ودل سے نثار تھے۔

موصوف ان اکابر علماء میں تھے جن کی شخصیت ہمہ جہت اور ہمہ گیر تھی،جو علوم اسلامیہ پر وسیع اور عمیق نظر رکھتے تھے،جن کو تقریر وتحریر دونوں کا ملکہ اللہ تعالی نے عطا کیا تھا۔

آپ کا علم وفضل،علوم وفنون میں درجۂ کمال حاصل تھا،فقہی بصیرت ہر شک وشبہہ سے بالاتر تھی۔آپ احادیث نبوی کے مزاج داں اور رمز شناس تھے۔آپ کی نگاہ دقیقہ رس،آپ کا ذہن رمز شناس تھا،آپ نے اپنے علمی سفر میں ایسے نقوش قدم چھوڑے ہیں جو مستقبل میں آنے والے نسلوں کے لیے چراغ راہ ثابت ہوں گے۔انشاءاللہ۔اہلِ علم ان کی روشنی میں اپنا علمی سفر پورے یقین واعتماد کے ساتھ جاری رکھ سکیں گے۔

بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ وسعت نظر،وسعت مطالعہ،رسوخ فی العلم اور ذکاوت میں آپ کی نظیر اس وقت ممالک اسلامیہ میں کم یاب ہے۔(**والغیب عند اللّٰہ**) آپ جیسی شخصیت برسوں میں پیدا ہوتی ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پر پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دید ور پیدا

اسلام اور عصرِ جدید (سہ ماہی)

کے خاص شمارے

اسلامی تہذیب وتمدن (دورِ جاہلیت سے آغاز اسلام تک).....۳۰۰روپے
نذرِ علی محمد خسرو.....۱۰۰روپے
بیاد خواجہ غلام السیّدین.....۱۰۰روپے
بیاد پروفیسر مشیر الحق.....۲۰۰روپے
افکارِ ذاکر.....۱۵۰روپے
مولانا عبیداللّٰہ سندھی.....۲۰۰روپے
ڈاکٹر سید عابد حسین اور نئی روشنی.....۲۵۰روپے
مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت.....۱۵۰روپے
نذرِ رومی.....۲۰۰روپے
قرآن مجید، مستشرقین اور انگریزی تراجم.....۱۰۰روپے
پیکر دین ودانش: امام غزالیؒ.....۳۰۰روپے
معلمِ عصر: سعید نورسیؒ ۲۰۰روپے

ان کے علاوہ پچھلے عام شمارے بھی ۱۰۰/روپے کی شرح سے دستیاب ہیں۔ اسٹاک محدود ہے۔ پانچ شماروں پر ۲۵ فیصد تجارتی کمیشن بھی دیا جائے گا۔ محصول رجسٹرڈ ڈاک خریدار کے ذمے ہوگا۔

رابطہ

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز
جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

Vol. LV | No. 1 | R.N.I. No. 17614/69 | January 2023

ISLAM AUR ASR-I-JADEED

ISSN 2278-2109

Zakir Husain Institute of Islamic Studies
Jamia Millia Islamia, Jamia Nagar, New Delhi-110025
Phone: 011-26841202